نگارِ پاکستان

مئی ۱۹۹۵ء

بانی:- علامہ نیاز فتح پوری

مدیر:- ڈاکٹر فرمان فتح پوری

مراسلت: سی ۲۸، بلاک ۱۳ ڈی، گلشنِ اقبال کراچی فون: ۴۹۸۰۴۴۰

مئی ۱۹۹۵ء

نگار پاکستان

بانی: علامہ نیاز فتح پوری

مدیر: ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر سرفراز نیازی
سرشار صدیقی
امراؤ طارق
ریاض نیازی

سی ۲۸، بلاک ۱۳، ڈی، گلشن اقبال کراچی
فون: ۴۶۳۳۶۷

اگر دونوں نے ایک ساتھ مئی کے مہینے میں وفات پائی تو چنداں تعجب کی بات نہیں - دیرینہ رفاقت کا تقاضا یہی تھا -

مئی کا نگار ایک مدت سے ان دونوں بزرگوں کے لئے وقف ہوتا ہے سو، اب کے بھی ہے - دونوں، غالب کے شیدائی تھے اور دونوں نے کلام غالب کی شرح لکھی ہے - اس لئے مناسب یہ خیال کیا گیا کہ مئی کے نگار میں دونوں کی شرحوں کے نمونے دیدئے جائیں چنانچہ زیر نظر شمارہ، غالب کے متداولہ دیوان کی ۲۸ ویں غزل تک کی شرح پر مبنی ہے - اس سے نہ صرف یہ کہ غالب کی تفہیم میں مدد ملے گی بلکہ مولانا حسرت اور علامہ نیاز کے ذہن نکتہ رس کا بھی اندازہ ہوسکے گا -

فرمان فتح پوری

مضامین

۱- شرحِ دیوانِ غالب — مولانا حسرت موہانی

۲- مشکلاتِ غالب — علامہ نیاز فتح پوری

مشکلاتِ غالب

(دیوانِ غالب کی شرح)

علامہ نیاز فتح پوری

ناشر

حلقۂ نیاز و نگار کراچی

مشکلاتِ غالب

غالب کے یہاں اتنے مختلف رنگ کے اشعار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اسکے دیوان کو زنجیر فرض کر لیں تو اس میں ہمیں کوئی کڑی کسی رنگ کی نظر آئے گی، اور کوئی کڑی کسی رنگ کی۔

اس کے یہاں تصوف و حکمت بھی ہے، وعظ و نصیحت بھی۔ خالص عاشقانہ رنگ بھی ہے اور رندانہ شوخی و بے باکی بھی۔ بلندیٔ تخیل بھی ہے اور سطحی نقاشی بھی —— گویا وہ ایک گلدستہ ہے مختلف رنگ کے پھولوں کا جس میں ہر شخص کو اپنے اپنے ذوق و پسند کا پھول مل جاتا ہے اور غالباً یہی سبب اس کے قبول عام کا ہے۔

غالب کا نام سنتے ہی اس کی مشکل پسندی و دقیق نگاری ہمارے سامنے آجاتی ہے اور اس میں شک نہیں، وہ فطرتاً عام راہ سے ہٹ کر اپنی راہ الگ پیدا کرنے والا، بڑا مشکل پسند انسان تھا اور بیان کے نئے نئے زاویئے تلاش کرنے کے لئے اس کا خیال ہمیشہ دماغ کی پیچیدہ راہوں سے گزر کر سامنے آتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ اپنے سہل و سادہ اشعار میں بھی کوئی نہ کوئی گرہ ضرور چھوڑ جاتا تھا۔ چہ جائیکہ حکمت و تصوف کے دقیق اشعار کہ انھیں تو معنوی نزاکت اور ندرتِ خیال کے لحاظ سے مشکل ہونا ہی چاہیئے۔

یہی وجہ تھی کہ مولانا حالی کو بھی یادگار غالب میں اسکے بعض اشعار کی شرح

کرنا پڑی اور اس کے بعد یہ سلسلہ ختم نہ ہوا یہاں تک کہ کلام غالب کی متعدد شرحیں وجود میں آگئیں۔

اس میں شک نہیں کہ شارحین غالب نے اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے کافی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔ بعض نے لفظی و لغوی تحقیق کو سامنے رکھا، بعض نے اس عقیدے کی بناء پر کہ غالب کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ممکن ہی نہیں، اس کے بعض بے معنی اشعار میں بھی کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی مفہوم پیدا کرنے کی کوشش کی۔

بعض شارحین ایسے بھی ہیں جن کو غالب کا ہر شعر، حکمت و فلسفہ نظر آیا، اور اس کی شرح و تفسیر میں وہ غالب سے زیادہ ناقابل فہم ہو کر رہ گئے، بعض شرحوں میں بہت اختصار و اجمال پایا جاتا ہے اور بعض میں ضرورت سے زیادہ اطناب۔ اس لئے ان تمام شرحوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک معتدل قسم کی شرح کی ضرورت یقیناً باقی تھی اور بعض احباب نے مجھ سے ایسی شرح لکھنے کی بارہا خواہش بھی کی۔ لیکن میں اس کے لئے وقت نہ نکال سکا۔

اس دوران میں اکثر طلبہ میرے پاس آئے اور انھوں نے غالب کے بعض اشعار کا مفہوم مجھ سے دریافت کیا تو مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ان کے اساتذہ نے جو مفہوم ان کو بتایا ہے وہ بہت اُلجھا ہوا ہے اور طلبہ کا ذہن و دماغ آسانی سے اسے قبول نہیں کر سکتا۔ بنا برآں مجھے خیال ہوا کہ غیر ضروری مباحث میں اُلجھے بغیر اگر سادہ الفاظ میں غالب کے مشکل اشعار کا مفہوم ظاہر کر دیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔

نیاز

غزل ۔ ۱

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

نقش = نگارخانۂ عالم یا تمام وہ اشیاء جو کائنات میں ہم کو نظر آتی ہیں ۔
شوخیٔ تحریر = شوخیٔ نقش ، یعنی نقاش کی اُپج ۔
کاغذی پیرہن = ناپائیدار لباس ، جس سے مراد ہے ہستیٔ ناپائیدار (اس میں رعایت ، اس قدیم رسم کی بھی ہے کہ فریادی کاغذ کا لباس پہن کر حاکم سے فریاد کرنے جاتا تھا)
کس کی = سوالیہ نہیں ہے بلکہ حیرت و استعجاب کے محل پر استعمال ہوا ہے ۔
مفہوم یہ ہے کہ :۔ اس نگارخانۂ عالم کی ہر ہر چیز ، نقاش ازل یعنی قدرت کے حضور میں زبان حال سے اپنی ناستواری و فنا پذیری کی فریاد کر رہی ہے ۔
یہ شعر تمہید کا ہے اور مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کائنات کے تمام مظاہر و آثار جملہ موجوداتِ عالم فنا پذیر ہیں اور خدا کے سوا کسی کو ثبات نہیں ۔

۲۔ کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
کاو کاو ۔ کھودنا ، کاوش ۔ غیر معمولی محنت ۔
سخت جانی ۔ انتہائی تکلیف جھیل جانے کی اہلیت ۔
جوئے شیر لانا ۔ اشارہ ہے فرہاد کے قصہ کی طرف کہا جاتا ہے کہ شیریں نے اسے پہاڑ

کھود کر جوئے شیر (دودھ کی نہر) لانے کا حکم دیا تھا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہم جس انتہائی کاوش و تکلیف کے عالم میں تنہائی کی راتیں بسر کر رہے ہیں وہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

"کاو کاو" اور "سخت جانی" "صبح" اور "جوئے شیر" میں جو مناسبت پائی جاتی ہے وہ ظاہر ہے یہ شعر عاشقانہ رنگ کا ہے اور غالب کی ندرتِ بیان کا پاکیزہ نمونہ۔

۳۔ جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے　　سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

دمِ شمشیر = تلوار کی دھار۔

دم = سانس۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے شوقِ شہادت کا جذبۂ بے اختیار دیکھئے کہ قاتل کی تلوار بھی قتل کے لئے بے اختیار ہو گئی اور اس کا دم باہر آگیا۔

"دم باہر آنا" بے اختیار ہونے کے مفہوم میں اردو کا محاورہ نہیں اور محض اختراع ہے غالب کی۔

اس شعر کی بنیاد لفظ دم پر قائم ہے کیونکہ دم سانس کو بھی کہتے ہیں اور دمِ شمشیر تلوار کی دھار کو بھی۔

ایسے ایہام کی شاعری کہتے ہیں جواب بالکل نامقبول ہے۔

۴۔ آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے　　مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

مفہوم یہ ہے کہ میرے اشعار سمجھنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے۔ لیکن ان کا سمجھنا محال ہے۔ یعنی جس طرح جال میں عنقا نہیں پھنس سکتی، اسی طرح فہم و ادراک کے جال میں میرے شعر کا مفہوم کبھی نہیں آسکتا۔

اسی مضمون کا ایک اور شعر غالب کا یہ ہے ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

۵۔ بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیر پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

آتش زیر پا = بیقرار۔ بیتاب۔

موئے آتش دیدہ = وہ بال جسے آگ دکھادی جائے یعنی بہت کمزور یا جلا ہوا

مفہوم یہ ہے کہ میں چونکہ اسیری میں بھی آتش زیر پا ہوں اس لئے میری زنجیر کا حلقہ موئے آتش دیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس شعر کی بنیاد صرف لفظ آتش پر قائم ہے اور اگر آتشِ زیر پا کی جگہ اس کا مترادف لفظ "بیقرار" رکھ دیا جائے تو شعر مہمل ہو کر رہ جائے۔ یہ شعر بھی ناپسندیدہ ایہام و رعایتِ لفظی کا نمونہ ہے اور تغزل سے باہر۔ لفظِ حلقہ "ہر حلقہ" کی جگہ استعمال کیا گیا ہے جو نقص سے خالی نہیں۔

غزل ۲

۱۔ جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

بتنگی = تنگی۔

حسود = حاسد۔

تنگیٔ چشم = بخل۔

بروئے کار آنا = سامنے میدان میں آنا۔

قیس (مجنوں) کے سوا کوئی اور صحرا میں اس کے مقابلہ کے لئے نہ آیا یعنی صرف وہی ایک میدانِ عشق کا مرد تھا۔

اس کی توجیہ غالب نے یہ کی کہ صحرا چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا اور اس میں دوسرے کی گنجائش نہ تھی۔

اس شعر کی بنیاد لفظ تنگی پر قائم ہے اور اس سے کافی ناجائز فائدہ اٹھایا گیا ہے

۲۔ آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

آشفتگی = پریشانی۔ پریشاں خاطری۔

نقشِ سویدا = دل کا سیاہ داغ یا نقطہ۔

دود = دھواں۔

نقش درست کرنا = نقش پیدا کرنا۔

مفہوم یہ ہے کہ ہمارا داغِ دل محض ہماری پریشاں خاطری کا نتیجہ ہے یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ داغ کا سرمایہ محض دود (دھواں) ہے جس کی آشفتگی ظاہر ہے۔ مدعا یہ کہ جب تک آشفتگی پیدا نہ ہو داغِ دل میسر نہیں آسکتا۔

۳۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

یہ شعر بھی غالب کے ان اشعار میں سے ہے جو باوجود سادہ ہونے کے مشکل ہی سے بغیر کسی تاویل کے سمجھ میں آسکتے ہیں۔

اس میں سب سے زیادہ الجھن "زیاں و سود" کے ذکر نے پیدا کردی ہے کیونکہ کسی سے معاملہ ہونا۔ باہم عہد و پیماں کی گفت و شنید" کا مفہوم رکھتا ہے اس سے اگر مجھ سے کا خطاب "محبوب" سے ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہم خواب میں تجھ سے معاملۂ محبت اور عہدِ وفا

لینے پر مجبور رہے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور سارا طلسم درہم برہم ہو گیا لیکن اس صورت میں "زیاں تھا نہ سود تھا" کہنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اگر خطاب خدا سے ہے تو مفہوم یہ ہوگا کہ کاروبارِ حیات سے رابطۂ قدرت سمجھنے کی کوشش محض خواب و خیال ثابت ہوئی اور ہماری بے خبری و ناآگہی بدستور باقی رہی جو سود و زیاں سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

۴۔ لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　　لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

مکتبِ عشق یا مکتبِ غم میں میری حیثیت اب بھی ایک مبتدی طالب علم سے زیادہ نہیں۔ یعنی جس طرح مکتب کی ابتدائی تعلیم میں رفت کے معنی گیا اور بود کے معنی تھا بتائے گئے تھے اسی طرح میں اب بھی اسی "رفت و بود" کا ابتدائی سبق لے رہا ہوں اور اس سے زیادہ کچھ خبر نہیں کہ دل کسی وقت اپنے پاس تھا اور اب وہ چلا گیا ہے۔

۵۔ ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

ننگِ وجود ہونا = وجود کے لئے باعثِ شرم ہونا۔

مفہوم یہ ہے کہ میں اپنی زندگی کے ہر رنگ میں وجود کے لئے باعثِ شرم تھا اور کسی لباس سے میرے عیوب چھپ نہ سکتے تھے۔ اس لئے اچھا ہوا کہ میں مر گیا اور کفن نے داغِ عیوب کو ڈھانپ لیا۔

۶۔ تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ　　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

سرگشتۂ خمار = متوالا۔

رسوم و قیود = دنیا کی پابندیاں۔

مفہوم یہ ہے کہ کوہکن (فرہاد) رسومِ ظاہری کا پابند تھا کہ اسکو مر جانے کیلئے سر

پر تیشہ مارنے کی ضرورت ہوئی۔ ہماری محبت فرہاد سے زیادہ بلند ہے اور جان دینے کے لئے ظاہری اسباب کی محتاج نہیں۔

غزل ۳

۱۔ کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا — دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

ہم نے مدعا پایا ۔ ہم تمہارا مطلب سمجھ گئے ۔

مفہوم یہ ہے کہ دل ہمارے پاس کہاں۔ وہ تو تمہارے ہی پاس ہے اور ازراہِ شوخی یہ کہتے ہو کہ اگر پڑا پایا تو نہ دیں گے ۔

۲۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

درد سے مراد "دردِ زندگی" ہے ۔

مدعا یہ کہ جب تک محبت نہ کی تھی۔ زندگی درد تھی۔ اب اس کی جگہ دردِ محبت نے لے لی جس کی کوئی دوا نہیں ۔

۳۔ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری — حسن کو تغافل میں جراتِ آزما پایا

حسن کی ظاہری سادگی و بے پروائی پر نہ جاؤ۔ یہ دراصل ہوشیاری ہے اور اس طرح وہ امتحان لینا چاہتا ہے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کی بے پروائی دیکھ کر عشاق اپنی حد سے آگے بڑھ جائیں ۔

غزل ۴

۳۔ میں عدم سے بھی پَرے ہوں ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

جب میں حالتِ عدم میں تھا تو اس وقت بھی میری "آتش نفسی" کا یہ عالم تھا کہ میری آہ سے عنقا کے پر جل جاتے تھے (عنقا ایک فرضی طائر ہے) لیکن اب تو میں دنیائے عدم سے بھی بہت دُور آگے نکل گیا ہوں۔ اس لئے اب اس عالم کا ذکر نہ کرو۔ جسے میں چھوڑ چکا ہوں۔

مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ مرتبۂ "فنائیت" نام صرف معدوم ہو جانے کا نہیں بلکہ اس سے بھی آگے گزر جانے کا ہے۔

صوفیہ کے یہاں درجۂ "ترکِ ترک" بھی قریب قریب یہی مفہوم رکھتا ہے۔

۴۔ عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

اندیشہ بمعنی فکر و خیال استعمال کیا گیا ہے۔

مدعا یہ کہ میں اپنے فکر و خیال کی گرمی کا کیا بیان کروں۔ گرمی کا تو یہ عالم ہے کہ میں نے صحرا کا محض تصور ہی کیا تھا کہ اس میں آگ لگ گئی۔ مبالغہ ہے لیکن گوارا۔

غزل ۵

۱۔ شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا
قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

ہر رنگ یعنی بہر رنگ، ہر طرح۔
شوق بمعنی عشق استعمال کیا گیا ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ عشق خواہ کسی رنگ میں سامنے آئے۔ ساز و سامان سے معرا نظر آئے گا یہاں تک کہ جب قیس (مجنوں) کی تصویر کھینچی جاتی ہے تو وہ بھی عریاں و برہنہ (ساز و سامان سے بے نیاز) کھینچی جاتی ہے۔

۲۔ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

"تنگیٔ دل" کے اظہار میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ یعنی میری تنگیٔ دل (رنج و ملال) کا یہ عالم ہے کہ تیر بھی اُس کے اندر سے نکلا تو پروں سمیت نہ نکل سکا اور دل ہی میں چھوڑ گیا حالانکہ میں چاہتا تھا کہ تیر تنگیٔ دل کی داد دیتا اور زخم کو وسیع کر دیتا۔

مدعا یہ کہ میں ایسا دل تنگ (رنجیدہ و ملول) انسان ہوں کہ محبوب کا تیر کھانے کے بعد بھی میری دل تنگی نہیں جاتی۔ اس شعر کی بنیاد محض لفظ تنگی پر قائم ہے۔ اگر اس کو نکال دیجئے تو شعر بے معنی ہو جائے۔

۳۔ دل حسرت زدہ تھا مائدۂ لذّتِ درد
کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

مائدہ = دستر خوان

بقدرِ لب و دنداں = یعنی محض اس حد تک کہ صرف لب و دنداں لذت حاصل کر سکیں۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ میرا دل حسرت زدہ تو لذت درد کا ایک کھلا ہوا وسیع دستر خوان

تھا جس سے کافی لذتِ درد حاصل کی جا سکتی تھی۔ لیکن لوگوں نے اس سے صرف "بقدرِ لبِ و دنداں" یعنی بہت کم فائدہ اٹھایا۔ یعنی میرے کلام کو جس نظرِ غائر سے دیکھنا چاہئے تھا لوگوں نے نہیں دیکھا اور اس کے محاسن کو پوری طرح نہیں سمجھا۔

۵۔ اے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

"ہمتِ دشوار پسند" سے خطاب ہے اور "نوآموزِ فنا" اس کی صفت ہے۔ یعنی ایسی ہمت دشوار پسند جو نوآموز فنا بھی ہے۔ "ہمتِ دشوار پسند" سے مراد وہ ہمت حوصلہ ہے جو دشواریوں سے گزرنا پسند کرے۔ اور "نوآموزِ فنا" سے مراد ہے "فنا کی منزل کا تجربہ رکھ کر اول اول اس سے گزرنے والا"۔

غالب اپنی "ہمتِ دشوار پسند" کو جو "نوآموز" بھی ہے خطاب کر کے کہتا ہے کہ تو باوجود نوآموز ہونے کے اپنی دشوار پسندیوں کی بدولت منزلِ فنا کی دشواریوں سے بآسانی گزر گئی اس لئے بتا کہ اب میں کیا کروں اور فنا سے زیادہ اور کونسی مشکل منزل ڈھونڈھ نکالوں کہ تیری دشوار پسندی کے حوصلے پورے ہوں۔

۶۔ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لفظ پھر سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی گریہ کیا گیا تھا لیکن کوئی قطرۂ اشک دل میں رہ گیا تھا اور اب اس قطرہ نے ایسا زور باندھا کہ طوفان برپا کر دیا۔

غزل ۷

۱۔ دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

باب نبرد = مقابلہ کرنے کا اہل۔
نبرد پیشہ = جنگ و مقابلہ کا شایق۔
مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ میدانِ محبت میں انھیں لوگوں کو آنا چاہیے جو سختیاں برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ لوگ اس کے اہل نہیں جو ابتدائی دشواریوں ہی میں ہمت ہار جاتے ہیں مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ عشق کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اسکے لئے بڑا کلیجہ چاہیے۔

۲۔ تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا   اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
زندگی میں ہر وقت موت کے کھٹکے سے میرا رنگ زرد رہتا تھا۔ یعنی کاروبارِ حیات میں مجھے کبھی خوشی حاصل نہ ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہ تمام اسباب زندگی فنا ہونے والے ہیں اور جس چیز کو بقا نہ ہو اس پر خوش ہونا کیا؟

۳۔ تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں   مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
فرد فرد = منتشر، بے ربط۔
یعنی اس وقت بھی جب محبت کے متعلق میرے خیالات اوراق پریشاں کی حیثیت رکھتے تھے اور میں اس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا نہ تھا۔ جذبۂ وفا کا قایل تھا اس لئے اب کہ میں اس ابتدائی منزل سے گزر گیا ہوں، میری وفاداری اور خوئے تسلیم و رضا کی پختگی کا کیا کہنا۔

غزل ۷

۱۔ شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

سُبحہ، تسبیح کو کہتے ہیں جس میں عموماً سو دانے ہوتے ہیں۔ میرے محبوب کو تسبیح ہاتھ میں لئے رہنا اس لئے پسند ہے کہ اس طرح وہ گویا ایک ہی وقت میں سو دل اڑانے کا سماں سامنے لے آتا ہے۔ غیر دلچسپ خیال آرائی کے سوا اس شعر میں کچھ نہیں۔

۲۔ بہ فیضِ بیدلی، نومیدیِ جاوید آساں ہے
کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

فیض بیدلی، حسرت و مایوسی کا فیض یا صدقہ۔

نومیدیِ جاوید، ناکامیِ دائم۔

مطلب یہ ہے کہ ہماری زندگی بڑی سخت گتھی تھی لیکن ہماری مایوسی نے زندگی کی تمام ناکامیوں کو آسانی سے جھیل کر اس کو آسانی سے سلجھا دیا اور کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل اس لئے پسند آیا کہ اس عقدہ کے حل کرنے میں اسے کسی کاوش سے کام لینا نہیں پڑا اور خود ہماری فطرت ہی نے اس کو حل کر لیا۔

۳۔ ہوائے سیرِ گل آئینہ بے مہریِ قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

قاتل کا سیرِ گل کی خواہش کرنا، اس کی بے مہری کا ثبوت ہے کیونکہ جب وہ پھول کو دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ کوئی بسمل اپنے خون میں لوٹ رہا ہے۔

۴۔ جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارک باد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

تحفہ، ارمغاں اور ہدیہ کا ایک مفہوم ہے۔

الماس۔ ہیرا۔ اس کے ٹکڑے زخم کو اور بڑھا دیتے ہیں۔
"غمخوارِ جانِ درد مند" سے مراد محبوب ہے۔
مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ اے اسد مبارک ہو کہ تمھارا محبوب جو تمھاری غمخواری کے لئے آیا ہے وہ جراحت، الماس اور داغِ جگر کے تحفے بھی اپنے ساتھ لایا ہے جو تمھیں بہت مرغوب ہیں یعنی وہ آیا تو تھا غمخواری کیلئے لیکن پہلے سے زیادہ تمھیں مجروح و درد مند بنا گیا۔
اگر غمخوار سے مراد ناصح ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس کی نصیحتوں سے میری درد مندیاں اور بڑھ گئیں۔

غزل ۸

۲۔ سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا
یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

سبزۂ خط کو زمرد سے تشبیہ دی ہے اور کاکل کو افعی سے۔ یعنی تیرا سبزۂ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیرے کاکل زہر افشانیاں کم نہ ہوئیں۔
مشہور ہے کہ زمرد کے سامنے سانپ اندھا ہو جاتا ہے لیکن کاکل کا افعی ایسا سخت افعی ہے کہ اس زمرد کا بھی اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ مدعا یہ کہ سبزۂ خط نمودار ہونے کے بعد بھی تیری زلف کاکل کی زہر افشانی کا عالم وہی ہے۔

۷۔ مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اس شعر میں غالب نے اپنی انتہائی ناتوانی کا اظہار کیا ہے۔ کہتا ہے کہ محبوب عیسیٰ نفس میرے اندر نئی زندگی پھونکنے آیا تھا لیکن یہاں ناتوانی کا یہ عالم تھا کہ اس نے

افسوس زندگی پڑھنے کے لئے لبوں کو جنبش ہی دی تھی کہ میں... اس جنبش کے صدمے سے مرگیا۔
مدعا یہ ہے کہ میرا حال دعا و دوا دونوں سے گزر گیا ہے اور میری جانبری کی کوئی صورت باقی نہیں۔

غزل ۹

۱۔ ستائشگر ہے زاہد اس قدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا

اس شعر میں زاہد کے تصور جنت پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ جس چیز کو جنت سے تعبیر کرتا ہے، ہماری نظر میں ایک گلدستہ سے زیادہ نہیں اور گلدستہ بھی وہ جسے ہم طاق نسیاں کے سپرد کر چکے ہیں یعنی جس کا کبھی خیال بھی نہیں آتا۔
مدعا یہ ہے کہ ہماری منزل عمل جنت کی طمع سے بہت بلند ہے اور ہمارا فلسفہ زندگی یہ نہیں کہ کسی لالچ یا غرض سے کوئی اچھا کام کریں۔

---

۲ بیاں کیا کیجئے بیداد کاوشہائے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

مژگاں یار کی کاوش ستم کا حال کیا بیان کیا جائے جب کہ اس نے ہمارے ہر قطرہ خون کو تسبیح مرجان کا دانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ (مرجان سرخ ہوتا ہے)
اس میں لفظ کاوش سے فائدہ اٹھا کر قطرۂ خوں کو دانۂ تسبیح ظاہر کیا گیا ہے کیونکہ تسبیح کے دانے بھی سوراخ کر کے بنائے جاتے ہیں۔ یہ شعر بھی محض الفاظ کا کھیل ہے اور ناگوار ندرت بیان۔

۳۔ نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

سطوت = رعب

دانتوں میں تنکا لینا = اظہارِ عجز و فرومایگی کو کہتے ہیں۔

بعض وحشی قبائل میں دستور تھا کہ جب دو مخالف قبیلے یکجا ہو جاتے تھے تو کمزور قبیلہ کا سردار قوی قبیلے کے سردار کے پاس دانتوں میں تنکا دبا کر جاتا تھا جس سے مقصود اپنی عاجزی کا اظہار ہوا کرتا تھا۔

مدعا یہ کہ میں قاتل کے سامنے اظہار عجز کے طور پر دانتوں میں تنکا لے کر گیا لیکن ہوا یہ کہ تنکا ریشہ نیستاں بن گیا یعنی بانسری کی طرح اس سے نالے پیدا ہونے لگے اور قاتل کا رعب بھی مجھے اس سے باز نہ رکھ سکا۔

۴۔ مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مضمر = پوشیدہ

ہیولا = اصل مادہ۔

خون گرم = محنت۔

میں اپنی تباہی کا گلہ کس سے کروں جبکہ خود میری ساخت و تعمیر میں خرابی کی صورت پوشیدہ ہے یعنی جس طرح دہقان کا محنت کر کے خرمن جمع کرنا بجلی گرنے کا باعث ہے۔ اسی طرح خود میرا وجود میری تباہی کا باعث ہے۔

---

۱۲ - نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالبؔ
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

جادہ = اس لکیر یا نشان کو کہتے ہیں جو راہگیروں کے نقشِ قدم سے راستے میں پیدا ہو جاتا ہے۔

شیرازہ۔ اُس تاگے کو کہتے ہیں جو کسی کتاب کے اوراق کو یکجا کر دیتا ہے۔

مدعا یہ ہے کہ ہماری نگاہ میں اصل چیز راہ فنا کا جادہ ہے کیونکہ آخرکار اسی سے شیرازہ عالم کے تمام اجزائے پریشاں منسلک ہو جاتے ہیں یعنی زندگی محض پریشانی و آشفتگی کا نام ہے اور مرتے دم تک ان سے مفر نہیں لیکن مرنے کے بعد یہ سب انتشار ختم ہو جاتا ہے اور عالم کے تمام اجزائے پریشاں ایک ہو جاتے ہیں۔

جادہ اور شیرازہ میں فی الجملہ ظاہری مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔

غزل ۱۲

۱- محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

• محرم = آشنا، واقف۔

نواہائے راز = عالمِ غیب کی صدائیں۔

اس شعر کی بنیاد لفظِ حجاب پر قائم ہے جس کے معنی پردہ کے بھی ہیں۔

لوگ کہتے ہیں کہ علائقِ دنیا کے حجابات حقیقت کے سمجھنے سے انسان کو باز رکھتے ہیں لیکن غالبؔ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، اگر انسان کے کان نواہائے راز اور عالمِ غیب کی صدا سے آشنا ہوں تو یہ حجابات بھی پردۂ ساز ہو جائیں اور ان سے سرمدی نغمے پیدا ہونے لگیں۔

۴۔ رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

رنگِ شکستہ = اُڑا ہوا رنگ۔ جب چہرہ کا رنگ اُڑتا ہے تو اس میں سفیدی سی جھلک آتی ہے اسی لئے رنگِ شکستہ کو صبح سے تشبیہ دی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ میرے اڑے ہوئے رنگ کا نظارہ معشوق کے لئے گویا وقتِ صبح کا نظارہ ہے جب عام طور پر پھول کھلنا شروع ہوتے ہیں اس لئے میری رنگِ شکستہ کی صبح کو دیکھ کر، محبوب کے گل ہائے ناز کو بھی کھلنا چاہیے۔ یعنی میری شکستگیٔ رنگ کو التفاتِ محبوب کا باعث ہونا چاہیے، اس شعر میں ناگوار تکلف و تصنع کے سوا کچھ نہیں۔

۵۔ ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

شیشہ باز = وہ شعبدہ باز جو سر پر شیشہ رکھ کر رقص کرتا ہے اور شیشہ نہیں گرنے پاتا۔

مفہوم یہ ہے کہ شیشہ جس میں شراب بھری ہے جوشِ بادہ سے ہر طرف اچھل رہا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بساطِ مے خانہ کا ہر گوشہ گویا کہ شیشہ باز کا سر ہے جس پر شیشے اچھل رہے ہیں۔

نہ مفہوم لطیف، نہ تعبیر و استعارہ قابلِ تعریف۔

غزل ۱۳

۳۔ گر ہوں دلِ دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں نشتر کھلا

دیوانگی دُور کرنے کے لئے عموماً نشتر سے فصد کھولی جاتی ہے۔ غالب کہتا ہے کہ ہر چند میں دیوانہ ہوں اور دوست بظاہر ہاتھ میں نشتر لے کر آیا ہے تاکہ وہ فصد کھول کر میری دیوانگی دُور کرے، لیکن میں اس فریب میں نہیں آ سکتا۔ کیونکہ وہ آستین کے اندر دشنہ (خنجر) بھی چھپائے ہوئے ہے اور اس کا مقصود فصد لے کر میری دیوانگی دور کرنا نہیں بلکہ دشنہ سے مجھے ہلاک کر دینا ہے۔

۵۔ ہے خیالِ حُسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خُلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

کہا جاتا ہے کہ جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے حسن عمل کی جزا میں بہشت کا دروازہ قبر میں کھل جاتا ہے۔ اس روایت کو سامنے رکھ کر غالب کہتا ہے کہ میں تو صرف حُسن یار کا تصور لے کر گور میں گیا تھا اور حسنِ عمل سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ پھر بھی خلد کا دروازہ کھل گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حسن کا تصور بھی بجائے خود بڑا حسنِ عمل ہے جس کی جزا میں خلد کا دروازہ میری گور کے اندر کھل گیا۔ ایک لطیف معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ حُسن کا تصور ہی بجائے خود خُلد آفریں ہے۔

۸۔ کیوں اندھیری ہے شبِ غم۔ ہے بلاؤں کا نزول
آج اِدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

پہلے مصرعہ کا پہلا ٹکڑا سوال ہے کہ شبِ غم اتنی تاریک کیوں ہے، خود ہی اس کا جواب دیتا ہے کہ شبِ غم میں آسمان سے بلائیں نازل ہو رہی ہیں اور ان بلاؤں کا تماشہ دیکھنے کے لئے آج دیدۂ اختر اوپر ہی کی طرف مائل ہے زمین کا رخ نہیں کرتا اور یہی سبب ہے شبِ غم کی اندھیری کا۔
یہ شعر دور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں۔

۹ - کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

کسی وقت دستور تھا کہ موت یا کسی حادثہ کی خبر جب کسی خط میں دی جاتی تھی تو اسے بند نہ کرتے تھے بلکہ کھلا ہوا بھیجتے تھے۔ غالب نے اسی رسم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے مصائب کا اظہار کیا ہے کہ آج کل نامہ بر وطن سے جو خط لاتا ہے وہ کھلا ہوا لاتا ہے جس میں بری خبر کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

غزل ۱۷

یہ غزل مسلسل ہے جس میں غالب نے ایک طرف اپنے عالمِ فراق کی بیتابی و اضطراب فرطِ گریہ و اشکباری کا حال ظاہر کیا ہے اور دوسری طرف محبوب کے سرد بردنشانیاں اور عالمِ استغنا کا۔

۱ - شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا
شعلۂ جوالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا

زہرۂ ابر آب تھا = ابر کا پتہ پانی ہو گیا تھا۔

مطلب یہ ہے کہ رات میرے سوزِ دل کی برقپاشی کا یہ عالم تھا کہ ابر کا پتہ بھی پانی ہو گیا تھا اور اس میں جو بھنور پڑتے تھے وہ بھڑکتے ہوئے شعلے نظر آتے تھے۔

اس شعر میں صرف شدّتِ اضطراب کا ذکر ہے اور وہ بھی حد درجہ ناگوار مبالغہ کے ساتھ جس میں محض دعوے ہی دعوے ہے اور ثبوت کوئی نہیں۔

۲۔ واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام
گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

عناں گیرِ خرام = مانعِ خرام۔
پنبۂ بالش = تکیہ کی روئی۔

مفہوم یہ ہے کہ وہاں نہ آنے کے لئے ان کو یہ عذر تھا کہ بارش ہو رہی ہے اور یہاں بحالتِ مایوسی آنسوؤں نے وہ طوفان برپا کر رکھا تھا کہ تکیہ کی روئی گویا کفِ سیلاب ہو کر رہ گئی۔

شعر میں ناگوار مبالغہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

تارِ نگہ کا نایاب ہونا = کچھ نظر نہ آنا۔

مفہوم یہ ہے کہ وہاں محبوب کے سنورنے کا یہ حال تھا کہ ایک ایک بال میں موتی پروئے جا رہے تھے اور یہاں بحالتِ انتظار فرطِ گریہ سے کچھ نظر نہ آتا تھا۔

• یعنی اُدھر بالوں میں موتی پروئے جا رہے تھے اور ادھر تارِ نظر میں ہائے اشک!

۴۔ جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

باغ میں سُرخ سُرخ پھولوں کی کثرت کا یہ عالم تھا کہ ان کے عکس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا جیسے آب میں چراغاں ہو رہا ہے اور یہاں مہجوری کا یہ عالم تھا کہ خون کے آنسو رونے سے فرصت نہ تھی۔

---

۵ - یاں سرِ پُر شور بیخوابی سے تھا دیوار جُو
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

دیوار جُو - دیوار ڈھونڈھنے والا

یہاں بیخوابی میں بار بار جی چاہتا تھا کہ دیوار سے سر ٹکرا دیا جائے اور وہاں محبوب کے سکون و بے خبری کا یہ عالم کہ کمخواب کے تکیہ پر سر رکھے ہوئے آرام سے سو رہا تھا۔

---

۶ - یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

یہاں یہ عالم تھا کہ ہر ہر سانس سے بزمِ بیخودی کی شمع روشن ہوتی تھی اور وہاں اغیار کی صحبت سے لطف اٹھانے کے لئے فرشِ گل بچھا ہوا تھا۔

---

۷ - فرش سے تا عرش واں طوفاں موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

وہاں زمین سے آسمان تک لطف و نشاط کا طوفاں برپا تھا اور یہاں محض جلنا ہی جلنا۔

غزل ۱۵

۱ - نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا
تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

یعنی رات میرا دل تڑپ تڑپ کر نالے کر رہا تھا لیکن بالکل بے اثر گویا میرا اضطراب

دانۂ سپند کا سا اضطراب تھا اور اس سے مقصود وصلِ غیر کو نظرِ بد سے بچانا تھا۔

دستور ہے کہ نظرِ بد سے بچانے کے لئے آگ میں دانۂ سپند ڈالتے ہیں جو چیخ کر باہر آجاتا ہے۔ اس لئے نالۂ بے اثر کو سپند سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۲۔ مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

مقدمِ سیلاب = سیلاب کی آمد۔

نشاط آہنگ = مسرور۔

سازِ صدائے آب = جلترنگ جس میں چینی کے پیالوں کے اندر پانی بھر کر لکڑی کی ضرب سے آواز پیدا کی جاتی ہے۔

سیلاب کی وجہ سے اپنے گھر کی تباہی پر میرا دل اس درجہ مسرور تھا کہ جو آواز گھر کے در و دیوار سے پیدا ہو رہی تھی وہ صدائے جلترنگ کا سا لطف دے رہی تھی۔

۳۔ نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں!
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

اندیشہ = خیال

سنجاب = ایک قسم کا قیمتی سمور۔

مفہوم یہ ہے کہ :-

خاکساری اور خاک نشینی کے زمانے میں جو نازِ استغنا مجھے حاصل تھا اس کا ذکر کیا کروں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں بسترِ خاک پر نہیں بلکہ بسترِ سنجاب پر آسودہ ہوں

۴۔ کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں
ذرّہ ذرہ رو کشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

کچھ نہ کی = یعنی کچھ نہ کیا۔
رو کش = مقابل۔

مفہوم یہ ہے کہ اپنا جنون ناقص و ناتمام تھا اس لئے اس نے کچھ نہ کیا ورنہ صحرائے جنوں کا تو ذرّہ ذرّہ روکش آفتاب ہے اور اگر ہم اپنے جنون میں کامل ہوتے تو ہم بھی باوجود ذرّہ حقیر ہونے کے آفتاب کا مقابلہ کرتے۔

۵۔ یاد کرو وہ دن کہ ہر یک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

محبوب سے کہتا ہے کہ وہ زمانہ یاد کر جب شکار کی جستجو میں تیرے دام (جال) کا "حلقہ (پھندا) دیدۂ بیخواب کی طرح کھلا رہتا تھا لیکن اب یہ دور ختم ہو گیا ہے کیونکہ تیرے دام میں اب اتنے صید آچکے ہیں کہ اب کسی تازہ شکار کی تجھے فکر ہی نہیں۔

۶۔ میں نے روکا رات غالبؔ کو وگرنہ دیکھتے
اس کے سیل گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

کثرتِ اشکباری کا اظہار انتہائی مبالغہ کے ساتھ کیا گیا ہے کہ اگر میں رات غالبؔ کو رونے سے باز نہ رکھتا تو اتنا عظیم سیلاب برپا ہو جاتا کہ آسمان بھی ایسا نظر آتا گویا اس سیلاب کا کف (جھاگ) ہے۔

غزل ۱۶

۱۔ ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب
خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

ودیعت = امانت۔

حالی نے "دینا پڑا" کا مفہوم "دینا پڑے گا" ظاہر کیا ہے حالانکہ اسکی ضرورت تھی مدعا یہ کہنا ہے کہ خونِ جگر صرف مژگان یار کی امانت تھا اور اسی کے لئے یہ خون بہنا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا اور میں نے دنیا کے اور بہت سے غموں میں بھی خون کے آنسو بہائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب مژگانِ یار نے اس امانت کا حساب مجھ سے لینا چاہا تو مجھے پھر از سر نو خون کے آنسو بہانا پڑے اور اس امانت کو اس طرح واپس کیا

۲۔ اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو
توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تھا

تمثال دار = عکس پیدا کرنے والا۔

آئینہ سے مراد آئینہ دل ہے۔

آئینہ اگر ٹوٹا ہوا نہ ہو تو اس میں ایک ہی عکس نظر آئے گا لیکن اگر ٹوٹ جائے تو اس کے ہر ہر ٹکڑے میں الگ الگ صورت نظر آئے گی۔ اس حقیقت کے پیش نظر غالب کہتا ہے کہ تو نے میرا دل (جو تیری آرزو کا آئینہ دار تھا) ٹکڑے ٹکڑے کر کے مجھے ہزاروں آرزوؤں کا ماتمدار بنا دیا۔

مدعا یہ کہ دل ٹوٹنے سے میری تمناؤں میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

غزل ۱۷

۴۔ جلوہ ازبسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

ازبسکہ = چونکہ۔

جوہرِ آئینہ ان لکیروں کو کہتے ہیں جو صیقل کے وقت آئینہ میں پڑ جاتی ہیں۔

تیرا جلوہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا ہر وقت اسی کو دیکھتی رہے اور تیرے اس تقاضائے جلوہ کا نتیجہ یہ ہے کہ خود جوہرِ آئینہ بھی مژگاں ہو جائے یعنی تجھے دیکھنے کی تمنا کرتا ہے۔

جوہرِ آئینہ کو مژگاں سے تشبیہہ دی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ دیکھنا مژگاں کا کام ہے یا نگاہ کا۔ اگر یہ کہا جاتا کہ جوہرِ آئینہ تارِ نگہ بن جانا چاہتا ہے تو زیادہ موزوں ہوتا۔

غزل ۱۸

۱۔ شب خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

شوقِ ساقی = شوقِ آمدِ ساقی

رستخیز اندازہ = قیامت کے مانند۔

محیطِ بادہ = خطِ ساغر یا خود ساغر مراد ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ رات ساقی کی آمد کا انتظار تھا اور اس کے نہ آنے سے ہم پر خمار کی کیفیت طاری تھی۔ لیکن یہ اس قیامت کی کیفیت تھی کہ مسلسل انگڑائیوں کی وجہ سے (جو لازمی نتیجہ ہیں خمار کا) خطِ ساغر یا خطِ شیشہ تک (یعنی تمام بزمِ بادہ میں) گویا ہنگامۂ قیامت

کی تصویر کھنچی ہوئی تھی۔ انگڑائیوں میں چونکہ ایک صورت ہنگامہ وتلاطم کی پائی جاتی ہے اس لئے اسے "رستخیز اندازہ" کہا گیا۔

غالب کا یہ شعر دُور از کار تخیل کے سوا کچھ نہیں اور اگر دونوں مصرعوں کی ردیف تھا کو بود کر دیا جائے تو فارسی کا شعر ہو جاتا ہے۔

۲۔ یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا
جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

دفترِ امکاں = عالمِ موجودات و ممکنات۔

جادہ = راستہ

اس شعر میں وحشت وجنون کی اہمیت کو ظاہر کیا گیا ہے کہ جب تک ہم نے دشتِ وحشت میں قدم نہ رکھا تھا ہم عالمِ امکاں کی حقیقت سے ناواقف تھے لیکن اس دشت میں قدم رکھتے ہی معلوم ہوا کہ راہِ جنوں تو ایک ایسا شیرازہ ہے جس سے دونوں عالم کے اجزا وابستہ ہو جاتے ہیں۔

مدعا یہ ظاہر کرنا ہے کہ بقا و فنا کی حقیقت کا صحیح علم عقل وہوش سے نہیں بلکہ وحشت وجنون ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

۳۔ مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے
خانۂ مجنونِ صحرا گرد، بے دروازہ تھا

صحرا گرد = مجنوں کی صفت ہے۔

وحشت خرامی = وحشت وجنوں کی حالت میں چل پڑنا۔

مفہوم یہ ہے کہ مجنوں کا ٹھکانا تو صحرا تھا جہاں نہ کوئی دروازہ تھا نہ کوئی اور روک ٹوک

پھر کیا وجہ تھی کہ لیلیٰ دیوانہ وار مجنوں تک نہ جا پہنچی ۔

اسی خیال کو غالب نے دوسری جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے :۔

"گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا "

---

۴ ۔ پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حُسن

دست مرہونِ حنا ، رخسار رہن غازہ تھا

حُسن کے استغنا کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اسباب آرائش سے بے نیاز رہے ۔۔ مگر اس کے ہاتھوں میں مہندی اور رخسار پر گلگونہ لگانے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اسباب آرائش سے بے نیاز نہیں ہے جو حُسن کی انتہائی رسوائی ہے ۔

---

۵ ۔ نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد

یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

فارسی میں چیزے را بباد دادن ، تباہ و برباد کر دینے کے معنی میں مستعمل ہے ۔

مفہوم یہ ہے کہ ہمارے نالوں نے دل کے ٹکڑے برباد و منتشر کر دیئے حالانکہ نالہ کی یادگار یہی منتشر اوراقِ دل تھے اور اب بربادیِ دل کے بعد وہ یادگار بھی باقی نہ رہی ۔"

دوسرے مصرعہ میں یادگارِ نالہ کے بعد لفظ بھی محذوف ہے ۔

غزل ۲۱

اس غزل کے اکثر اشعار مومن کے رنگ کے ہیں :۔

۱ ۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

نشاطِ کار = کام کرنے کا حوصلہ۔

کاروبارِ عالم کی رونق صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے اور ہر شخص کو مرنا ہے اسی خیال کے زیرِ اثر ہر شخص مصروفِ کار رہتا ہے۔ اگر موت کا کھٹکا نہ ہو تو پھر یہ تمام ہنگامۂ دنیا ختم ہو جائے اور جینے کا کوئی لطف باقی نہ رہے۔

۲۔ تجاہل پیشگی سے مدعا کیا | کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا؟

تجاہل پیشگی = جان بوجھ کر انجان بننا۔

یہ جو تم میری ہر بات پر انجان شخص کی طرح "کیا کیا" کہا کرتے ہو اگویا کچھ جانتے ہی نہیں، تو اس سے آخر تمہارا کیا مطلب ہے۔ میں جانتا ہوں کہ تم میرے حال سے خوب واقف ہو اور تمہارا یہ بار بار کا سوال تجاہلِ عارفانہ کے سوا کچھ نہیں۔

۳۔ نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں | شکایت ہائے رنگیں کا گلہ کیا

دشمن پر آپ کی بیجا نوازشیں دیکھ کر اگر میں شکایتیں کرتا ہوں تو آپ کو اس کا گلہ کیوں ہے؟

شکایتوں کو رنگین اس لئے کہا گیا کہ اس کا تعلق محبوب اور غیر کے ربطِ رنگیں سے ہے

۴۔ نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں | تغافلہائے تمکیں آزما کیا

میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بالکل بے حجاب اور بے تکلف ہو کر ملو لیکن تم تغافل سے کام لیتے ہو جو میرے لئے سخت صبر آزما ہے

---

۵ - فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

خس ۔ تنکا ۔ گھاس پھونس ۔

اہلِ ہوس کی محبت بالکل ایسی ہی ہے جیسے خس میں آگ لگا دی جائے اور وہ دم کے دم میں بھڑک کر ختم ہو جائے اس لئے ایسی ناپائیدار محبت کرنے والے سے وفا کی امید رکھنا عبث ہے ۔

---

۶ - نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے تغافلہائے ساقی کا گلہ کیا

ہماری ہر سانس خود اپنے ہی دریائے بیخودی کی موج ہے اس لئے ساقی کے تغافل کی شکایت بیکار ہے کیونکہ اس کے تغافل سے ہماری بے خودی میں تو کوئی کمی ہو نہیں سکتی ۔

---

۷ - دماغِ عطرِ پیراہن نہیں ہے غمِ آوارگیہائے صبا کیا

غالب کا یہ شعر باوجود سادہ ہونے کے کافی الجھا ہوا ہے ۔

عطر محض خوشبو کو کہتے ہیں اسلئے عطرِ پیراہن کے معنی "خوشبوئے لباس" کے ہوئے ۔

"دماغ نہ ہونا" یعنی برداشت نہ ہو سکنا ۔

سوال یہ ہے کہ یہاں کس کا پیرہن مراد ہے ؟ اپنا یا محبوب کا ! بعض حضرات نے خود غالب کا لباس قرار دیا ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہاں لباسِ یار مراد ہے اور غالب یہ کہنا چاہتا ہے کہ اگر صبا کی آوارگی پیراہنِ محبوب کی خوشبو کو ادھر اُدھر لئے پھرتی ہے اور ہم تک نہیں پہنچاتی تو ہم کو اس کا غم کیوں ہو جب کہ خود ہم میں اس خوشبو سے لطف اٹھانے کی تاب نہیں ۔

شرح دیوانِ غالب
از
مولانا حسرت موہانی

۷۸۶

ردیف "الف"

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا	۱	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
کاو کاوِ سخت جانیہائے تنہائی نہ پوچھ	۲	صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا
جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے	۳	سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا
آگہی دامِ شنیدن جسقدر چاہے بچھائے	۴	مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا
۵	بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیرپا موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا	

۱ نقش یعنی تصویر۔ تصویر چونکہ کاغذ پر ہوتی ہے اسلئے اُسے فریادی کہا کیونکہ ولایت میں فریادی کاغذی پیرہن پہنکر عدالت میں جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہستی چونکہ موجبِ ملال وآزار ہے؛ اسلئے تصویر بھی اپنے صانع کی بزبانِ حال شکایت کرتی ہے کہ مجھکو ہست کر کے کیوں مبتلائے رنجِ ہستی کیا (ماخوذ از عودِ ہندی) مقصودِ شاعر یہ ہے کہ ہستی بہرحال (یعنی اگرچہ مثل ہستیٔ تصاویر اعتبارِ محض ہو) موجبِ آزار ہے۔۱۲

۲ یعنی شبہائے ہجر کا کاٹنا ویسا ہی سخت ہے جیسا کہ فرہاد کے لیئے جوئے شیر کا لانا تھا۔ صبح اور جوئے شیر میں جو مشابہت ہے وہ ظاہر ہے۔۱۲

۳ یعنی عاشق کی شوق شہادت کی کشش کا یہ اثر ہے کہ دمِ شمشیر سینۂ شمشیر سے باہر نکلا پڑتا ہے۔۱۲

۴ یعنی ہماری تقریر ایسی ہے کہ اسکے مفہوم سے (باوجود کوششِ بسیار) کوئی آگاہی نہیں حاصل کر سکتا۔۱۲

۵ آتش زیرپا یعنی بیقرار۔ موئے آتش دیدہ یعنی بال جسکا حلقہ جلکر بہت کمزور ہو گیا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ میرے جنونِ بیقرار کے مقابلے میں حلقہ ہائے زنجیر کی مضبوطی کی کچھ ہستی نہیں ہے۔ موئے آتش دیدہ اور آتش زیرپا میں جو رعایت لفظی ہے وہ ظاہر ہے ۱۲

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا	۱ھ	تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا
بفیضِ بیدلی نومیدیِ جاوید آساں ہے	۲ھ	کشایش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریِ قاتل	۳ھ	کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

۴ھ

جراحت تحفہ الماس ارمغاں داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

۱ھ تسبیح میں چونکہ سو۱۰۰ دانے ہوتے ہیں اسلئے ظاہر ہے شمارِ سبحہ سے "بیک کف بردن صد دل" کی تشبیہ نکلتی ہے مشکل پسند بمعنی کر و فریب پسند۔ ۱۲

۲ھ نومیدی جاوید ایک عقدۂ مشکل تھا۔ اب بربنائے بیدلی وہ آسان ہو گیا ہے۔ گویا کشایش نے اپنا عمل کرنے کے لئے ہمارا عقدۂ مشکل (نومیدی جاوید) پسند کیا یعنی ہمکو بیدل بنا کر نومیدی جاوید کو ہمپر آسان کر دیا۔ ۱۲

۳ھ گل اپنی سرخی کیوجہ سے چونکہ بسملِ بخون غلطیدہ سے مشابہ ہوتا ہے اسلئے مطلب یہ ہے کہ خواہشِ سیرِ گل سے اُس بیدرد کی بے مہری ظاہر ہوتی ہے کیونکہ سیرِ گل سے اسکی غرض گویا تماشائے بسمل سے ہے۔ ۱۲

۴ھ اسد مبارکباد کہ جراحت بصورت تحفہ۔ الماس بصورتِ ارمغان و داغ جگر بصورت ہدیہ غمخوار جان دردمند آمدہ است۔ مبارکباد دیکر اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے ۱۲

یا یہ کہ غمخوارِ جانِ دردمند یعنی یار آیا ہے اور جراحت، الماس و داغ جگر بطور ہدیہ ہمراہ لایا ہے۔ ۱۲

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا، مگر، بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست ۱
ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز ۲
لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی
میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد
سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

۱ سویدا کو داغ سے اور آشفتگی کو دود سے تشبیہ دی ہے۔ ۱۲

۲ یعنی ہنوز مبتدی ہوں جس طرح لڑکے پہلے آمد نامہ پڑھتے ہیں۔ ۱۲

کہتے ہو نہ دینگے ہم دل اگر پڑا پایا ۱
دل کہاں کہ گم کیجے ہم نے مدعا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا ۲
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا

دوستدار دشمن ہے اعتمادِ دل معلوم ۳
آہ بے اثر دیکھی نالہ نارسا پایا

سادگی و پرکاری بیخودی و ہشیاری ۴
حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے آج ہم نے اپنا دل ۵
خوں کیا ہوا دیکھا گم کیا ہوا پایا

حالِ دل نہیں معلوم لیکن اس قدر یعنی
ہم نے بارہا ڈھونڈا تم نے بارہا پایا

شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا ۶
آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا

۱ ہم نے مدعا پایا یعنے ہم آپ کا مطلب سمجھ گئے کہ آپ نے ہمارا دل پا لیا ہے اور یہ باتیں کہ دو اگر ہم تیرا دل پائینگے تو نہ دینگے " دل پا لینے کے بعد کی ہیں یعنی جیسے لوگ کوئی گم شدہ چیز

پاکر چھیڑنے کے لئے مالک بشے سے کہا کرتے ہیں۔ ۱۲

ف۲ درد کی دوا پائی کیونکہ زیست کا مزا پایا۔ اور درد بے دوا پایا کیونکہ عشق ایک دردِ لا دوا ہے ۱۲

ف۳ معلوم بمعنی معدوم۔ آہ و نالہ جو دوستدار تھے وہ بصورت بے اثری و نارسائی دشمن ثابت ہوئے۔ اسیطرح ہمکو دل کا بھی اعتبار نہیں ہے۔ ۱۲

ف۴ اہلِ حُسن کی ظاہری سادگی اور بے پروائی سے مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے مشتاقوں کی جراَت کو آزمائیں یعنی یہ دیکھیں کہ انکو سادہ سمجھکر اربابِ اشتیاق جراتِ گستاخی تو نہیں کرتے اس سے ظاہر ہے کہ اس قسم کی سادگی کو درحقیقت پُرکاری اور بیخودی کو ہشیاری سمجھنا چاہیئے۔ ۱۲

ف۵ یعنے غنچے کو دیکھکر ہمکو اپنا دلِ گم گشتہ و خون شدہ یاد آیا۔
یا یہ کہ آمدِ فصلِ گل سے ہمارا جوش جنون پھر تازہ ہوگیا۔ مطلب ثانی زیادہ مناسب ہے۔ واللہ اعلم

ف۶ آپ سے یعنے ناصح سے۔

دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جلگیا		آتشِ خاموش کی مانند گویا جلگیا
دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں		آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جلگیا
میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا	ف۱	میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جلگیا
عرض کیجئے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں	ف۲	کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جلگیا
دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار	ف۳	اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جلگیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل
دیکھکر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جلگیا

۱ اے وہ کہ میرے مرتبۂ عدم سے ناواقف ہے سُن کہ میں پہلے ہی فنا کے اس عالم میں تھا کہ بارہا میری آہ آتشیں سے بازوے عنقا جلگیا اور اب تو اس درجہ عدم سے بھی پرے ہوں۔ واللہ اعلم ۱۲

۲ عرض کیجئے یعنی پیش کیجئے۔ عرض و جوہر میں رعایت لفظی ہے۔
جوہر اندیشہ کی گرمی کا بیان یہ ہے کہ وحشت کا صرف خیال آیا تھا کہ اُسکے اثر سے صحرا جلنگیا۔ یعنی چونکہ وحشت کی حالت میں صحرا نوردی کی نوبت ضرور آتی اسلئے خیالِ وحشت سے صحرا جلنے لگا واللہ اعلم۔ ۱۲

۳ کار فرما یعنی حکم فرما۔ ہر کام کے لئے ایک کام لینے والا (کار فرما) اور بہت سے کام کرنیوالے (کارکن) ہوتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ دل جو اس چراغاں یا داغوں کی بہار کا کار فرما تھا وہی نہ رہا ورنہ تجھکو اس چراغاں کی کیفیت دکھاتا۔ ۱۲

۱ شوق ہر رنگ رقیبِ سر و ساماں نکلا / قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا
۲ زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب / تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل / جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
۳ دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد / کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا
۴ ہے نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند / سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

۱ شوق یعنی عشق۔ رقیب یعنی دشمن۔ مطلب یہ ہے کہ عشق سر و ساماں کا دشمن ہے

دیکھو کہ مجنوں تصویر میں بھی عریاں رہتا ہے۔ بقول غالب قیس کی تصویر عریاں ہی کھینچی جاتی ہے۔ ۱۲

٢ ”زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی“ یعنی تنگیٔ دل کو زائل نہ کیا۔
مطلب یہ ہے کہ تیر خود ضیق مقام سے گھبرا کر پریشاں اور سراسیمہ نکل گیا وہ تنگیٔ دل کی داد کیا دیتا۔ دعوہ بندی!
اس شعر میں زخم تیر کی توہین بسبب ایک رخنہ ہو نکلنے کی ہے۔ مثلاً ایک دوسرے شعر میں بھی زخم تیغ کو جراحت پیکاں پر فوقیت دی ہے۔ لکھتا ہے۔

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں ✤ وہ زخم تیغ ہے جسکو کہ دلکشا کہیے

٣ یعنی میرے یاران ہمنشین میں سے ہر ایک میری حسرت دل سے بقدر استعداد متاثر ہوا۔ ۱۲

٤ درس فنا درحقیقت نہایت مشکل ہے لیکن میری ہمت دشوار پسند کا یہ حال ہے کہ وہ درس فنا لے رہی ہے لیکن ہنوز اپنے کو مبتدی سمجھتی ہے یعنی درس فنا کو آسان سمجھتی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ میری ہمت دشوار پسند فنا سے بالاتر کوئی مرتبہ چاہتی ہے کیونکہ اسکے نزدیک فنا ایک ابتدائی درجہ ہے۔ ۱۲

دہر میں مرگیا جو نہ مرد نبرد تھا		عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا
تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا		اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا
تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں	١	مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا
دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب	٢	اس رہگذر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا
جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی	٣	دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے		زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ف۱ یعنی عالم طفلی ہی سے میں بندۂ وفا ہوں جبکہ خیالات میں پختگی اور جمعیت بھی نہیں آئی تھی ۱۲
ف۲ اس رہگذر میں (یعنی دل سے جگر تک) کبھی زمانے میں شادابی کا یہ عالم تھا کہ جلوۂ گل گرد تھا یا اب یہ کیفیت ہے کہ وہی رہگذر دریائے خوں کا ساحل بنا ہوا ہے۔ ۱۲
ف۳ یعنی دل کے جانے کے بعد بھی اندوہِ عشق کی کشمکش نہ گئی کیونکہ اس حالت میں دل کے جانیکا افسوس رہا مثلاً میر تقی ف۵ غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا ÷ دم کے جانیکا نہایت غم رہا ۱۲

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا	ف۱	ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا
سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا	ف۲	یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا
میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں		وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا
دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی	ف۳	گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا
ہوں ترے وعدہ نہ کرنے میں بھی راضی کہ کبھی	ف۴	گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا
کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجیے		ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

ف۱ لفظ وفا کا مفہوم حقیقی مفقود ہو گیا ہے مثلاً آجکل نئے ریفارمروں کی تقریروں میں الفاظ "قوم" و "قومی" کا مفہوم۔ ۱۲

ف۲ کہتے ہیں کہ عکسِ زمرد سے سانپ مغلوب ہو جاتا ہے ۱۲-

ف۳ سرمنزل۔ یعنی منزل۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تقویٰ ممکن نہیں ہے تو رندی ہی سہی - ۱۲

ف۴ میں اس میں بھی راضی ہوں کہ تو نے وعدہ نہ کیا کیونکہ اگر تو وعدۂ لطف کرتا تو میرے کان ان الفاظِ تسلی کے احسانمند ہوتے حالانکہ مجھکو یہ پسند نہیں ہے۔ اسی قسم کے مضمونکا ایک دوسرا شعر بھی ہے ف۵ درد منت کشِ دوا نہوا ٭ میں نہ اچھا ہوا برا نہوا - ۱۲

ستایشگر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا ف۱ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودونکے طاق نسیانکا

بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوشہائے مژگاں کا کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ف۲ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاؤنگا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ (یعنی حالت) تیرے جلوے نے کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ف۳ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقانکا

اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے دربانکا

خموشی میں نہاں سرگشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں چراغِ مردہ ہوں میں بیزباں گورِ غریبانکا

ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے ف۴ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زندانکا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ سبب کیا خواب میں آکر تبسمہائے پنہانکا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا ف۵ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگانکا

ف۶ نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشانکا

۱ کہتا ہے کہ ہم بیخودی کے ایسے خوشگوار عالم میں رہتے ہیں جسکے مقابلے میں ہمنے جنت کو بھی فراموش کر دیا ہے - ۱۲

۲ سینے دانتوں میں تنکا اظہار عجز کے سبئے لیا تھا لیکن وہ ریشۂ نیستان بنگیا یعنی قاتل کا رعب وہ اب میرے نالونکو روک نہ سکا - ۱۲

۳ ہیولی یعنی مادہ - خون گرم یعنی جوش محبت مجازاً بمعنی سعی و کوشش -

دوسرا مصرعہ پہلے کی شرح کرتا ہے - مطلب یہ ہے کہ لوگ میری بہبودی کے لئے سعی کرتے ہیں لیکن میری بدبختی کا اثر دیکھئے کہ اس میں فائدے کے بجائے میرے علاوہ میرے محسن کو بھی نقصان پہونچتا ہے -

دوسرونکی سعی کو خون گرم دہقان سے مشابہت دی ہے اور خود کو خرمن سے - اور اس کوشش کے مضر ہو جانے کو برق خرمن سے تعبیر کیا ہے - برق خرمن جب خرمن کو خاک سیاہ کر دیگی تو ظاہر ہے دہقان کو بھی نقصان پہونچیگا -

مرزا نے چودھری عبدالغفور سرور کے نام ایک خط لکھا ہے اس میں بھی اسی قسم کا مضمون ہے لکھتے ہیں - " میں پانچ برس کا تھا کہ میرا باپ مرا - نو برس کا تھا کہ چچا مرا - اسکی جاگیر کے عوض میرے اور میرے شرکائے حقیقی کے واسطے شامل جاگیر نواب احمد بخش خاں دس ہزار روپے سال مقرر ہوئے اُنھوں نے نہ دئیے مگر تین ہزار روپے سال - مینے سرکار انگریزی میں یہ غبن ظاہر کیا، کولبرگ صاحب بہادر رزیڈنٹ دہلی اور استرلنگ صاحب سکرتر گورنمنٹ کلکتہ میرا حق دلوانے پر متفق ہوئے - رزیڈنٹ معزول ہو گئے - سکرتر بمرگ ناگاہ مر گئے -

بعد ایک زمانے کے بادشاہ دہلی نے پچاس روپے مہینا مقرر کیا - اُنکے ولیعہد نے

چار سو روپیہ سال۔

ولیعہد اس تقرر کے دو برس بعد مر گئے۔ واجد علیشاہ بادشاہ اودھ کی سرکار سے بصلۂ مدح گستری پانسو روپیہ سال مقرر ہوئے وہ بھی دو برس سے زیادہ نہ جئے۔ یعنی اگرچہ اب تک جیتے ہیں مگر سلطنت جاتی رہی اور تباہی سلطنت دو ہی برس میں ہوئی۔ دہلی کی سلطنت کچھ سخت جان تھی سات برس مجھکو روٹی دیکر بگڑی۔ ایسے مربی کش اور محسن سوز کہاں پیدا ہوتے ہیں، اب جو والی دکن کی طرف رجوع کروں، یاد رہے کہ متوسط یا مر جائیگا یا معزول ہو جائیگا اور اگر یہ دونوں امر وقوع نہوے تو کوشش اس کی ضائع جائیگی اور والی شہر مجھکو کچھ نہ دیگا اور اگر اسنے سلوک کیا تو ریاست خاک میں ملجائیگی۔ ۱۲"

ف۴ خیالِ یار کو یوسف اور دل افسردہ کو حجرۂ زنداں قرار دیا ہے۔ ۱۲

ف۵ معلوم نہیں کہ تیری جفا سے کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا جس کی ندامت کے باعث سے تیری آنکھیں سرشک آلود ہیں۔

ف۶ یہ یعنی جادۂ راہِ فنا دنیا کے اجزاے پریشاں کا شیرازہ ہے کیونکہ جملہ موجودات عالم فنا ہونے کے معاملے میں ایک ہی روش رکھتے ہیں۔

نہو گا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا ف۱ | حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بیدماغی ہے کہ
کہ موجِ بوے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

ف۱ یک بیاباں ماندگی یعنی کثرت ماندگی ذوق — یعنی ذوقِ رہ نوردی۔ نقش قدم کو حباب اور رفتار کو موج قرار دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جسطرح حباب موج کے ساتھ ہی ساتھ چلتا ہے اور کبھی ماندہ

نہیں ہوتا اسیطرح میرا ذوقِ صحرا نوردی بھی کسی طرح کم نہوگا۔ ۱۲

سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ الفتِ ہستی ۱ عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا

۲ بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی
جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

۱ افسوس حاصل کا۔ یعنی اپنی ہستی کا۔ برق۔ یعنی برقِ عشق۔ مطلب یہ ہے کہ میں طاعت گذار ہوں برقِ عشق کا اور طالب ہوں فنا کا لیکن ساتھ ہی اسکے چونکہ الفتِ ہستی بھی فطرت انسانی میں داخل ہو گئی ہیں اس حاصل یعنی ہستی کا افسوس کرتا ہوں جس سے میرے کمالِ عشق فنا میں کسیقدر نقص بھی نمودار ہے۔ ۱۲

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا ۱ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ۲ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا
تو اور سوئے غیر نظرہائے تیز تیز میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا
صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا و گرنہ میں ۳ طعمہ ہوں ایک ہی نفسِ جاں گداز کا
ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے ۴ ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا
کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز ۵ ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسد
سینہ۔ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

۱ یاں یعنی دنیا میں۔ حجاب یعنی پردہ جسکو پردۂ ساز کے ساتھ مناسبت لفظی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ وہ راز کے نغموں سے تو خود ہی ناآشنا ہے ورنہ دنیا میں جو بظاہر حجاب نظر آتے

ہیں وہ بھی پردۂ ساز کی طرح بول رہے ہیں اور بج رہے ہیں اور اسرارِ الٰہی ظاہر کر رہے ہیں (یادگارِ غالب)۔ ۱۲

ف۲ یہ شعر ویسا ہی ہے جیسا کہ غالب کا ایک دوسرا شعر ہے۔

ہو کے عاشق وہ پریرو اور نازک بن گیا ؎ رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے ۔ ۱۲

ف۳ صَرفہ بمعنی فائدہ۔ ضبطِ آہ میں میرا فائدہ ہے کیونکہ بحالتِ دیگر ایک ہی نفسِ جانگداز مجھے فنا کر دیتا۔ ۱۲

ف۴ شیشہ بازی: رقاصی کا ایک فن ہے جس میں رقاص پانی اور گلاب کی صراحیاں اور شیشے سر پر لیکر رقص کرتے ہیں لیکن شیشے گرنے نہیں پاتے۔ یہاں شیشوں کے اُچھلنے کے سبب سے بزمِ عیش کے گوشۂ فرش کو شیشہ باز کہا ہے۔ ۱۲

ف۵ اس گرہ نیم باز کا یعنی دل کا۔ قرض یعنی قرض کا دش۔ قرض اور گرہ میں رعایتِ لفظی ہے ۱۲

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	ف۱	رکھیو یا رب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا
شب ہوئی پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا	ف۲	اس تکلف سے کہ گویا بتکدے کا در کھلا
گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب	ف۳	آستیں میں دشنہ پنہاں ہاتھ میں خنجر کھلا
گو نہ سمجھوں اسکی باتیں گو نہ پاؤں اسکا بھید		پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا
ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال	ف۴	خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
منہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں		زلف سے بڑھکر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا
در پہ رہنے کو کہا اور کہکے کیسا پھر گیا		جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا
کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	ف۵	آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال ۶	نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

۷	اُسکی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند واسطے جس شہ کے غالب گنبدِ بے در کھلا

۱ بہادر شاہ ظفر کے مذاق سخن اور مجمع شعرا کے لحاظ سے بزم شاہنشاہ کو گنجینۂ گوہر کہا۔ ۱۲

۲ بتکدے میں چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ستاروں کو چراغ سے مشابہت ہے۔ یا یہ کہ ستارے خود بتوں سے مشابہ ہیں۔ ۱۲

۳ یعنی ظاہر میں تو دوست کو علاج دیوانگی منظور ہے مگر آستین میں مجھے قتل کرنے کے لیے خنجر پوشیدہ ہے۔

۴ کہتے ہیں کہ اعمالِ نیک کی بدولت قبر میں دروازۂ جنت کھل جاتا ہے۔ یہاں غالب خیالِ حسن کو حسنِ عمل سے مشابہ قرار دیتا ہے کیونکہ حسن کی رنگینی اور بہار کے اعتبار سے خیالِ حسن سے گوشۂ لحد نمونۂ خلد بنگیا ہے۔ ۱۲

۵ کیوں اندھیری ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ "آج بلاؤں کا نزول ہے" اور مصرعۂ ثانی میں اسکی تشریح ہے کہ "آج اُدھر ہی کو رہیگا دیدۂ اختر کھلا"۔ اختر کو بلاؤں سے جو نسبت ہے وہ ظاہر ہے۔ اس شعر میں غالب اپنی تیرہ اختری کا ذکر کرتا ہے ۱۲۔ واللہ اعلم۔

۶ قاعدہ ہے کہ اخبارِ مرگ و حوادث کے متعلق خطوط اکثر کھلے ہی ہوئے روانہ کئے جاتے ہیں۔ ۱۲

۷ گنبدِ بے در کھلا یعنی شب معراج میں۔ گنبد بے در یعنی آسمان۔ ۱۲

شب کہ برق سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا ۱	شعلۂ جوالہ ہر اک حلقۂ گرداب تھا

واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام ٢
گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا

واں خود آرائی کو تھا موتی پرونیکا خیال
یاں ہجومِ اشک میں تارِ نگہ نایاب تھا

جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو
یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا

یاں سرِ پرشور بیتابی سے تھا دیوار جو ٣
واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا

یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی
جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا

فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا
یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

ناگہاں اس رنگ سے خونابہ ٹپکانے لگا ٤
دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذت یاب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا ٥
تھا سپند بزمِ وصلِ غیر گو بیتاب تھا

مقدم سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے ٦
خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا

نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں ٧
پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا

کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے ورنہ یاں ٨
ذرہ ذرہ روکشِ خورشیدِ عالمتاب تھا

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے
کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا
انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے
اُسکے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

سلہ ابر کا پتا پانی ہو جاتا تھا۔ اس بیان کی خوبی ظاہر ہے کیونکہ قطرۂ باران سے اسکا ثبوت ملتا ہے ۱۲

سلہ بالش یعنی تکیہ۔ پنبۂ بالش کی تشبیہ (کثرتِ گریہ کے باعث سے) کفِ سیلاب سے ظاہر ہے ۱۲
خلاصہ مطلب یہ ہے کہ وہ عذرِ بارش کی بنا پر یہاں تک نہ آسکے اور میں روتا رہا۔ ۱۲

ف۳ دیوار جو تہا یعنی سر ٹکرانے کے لئے دیوار تلاش کرتا تہا۔ اس پورے قطعے میں اپنی محرومی اور محبوب کی بے پروائی کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ ۱۲

ف۴ اس رنگ سے خونابہ چکانے لگا یعنی اس طور پر غزل سرا ہوا۔ یہ اس غزل کے دوسرے حصے کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

ف۵ نایاب تہا یعنی نہ تہا۔ سپند نظر بد سے بچانے کے لئے جلایا جاتا ہے۔ دوسرے مصرعے میں نایابی اثر کی تشریح کرتا ہے کہ دل جل رہا تہا مگر کیا تہا گویا غیر کی بزم وصل کا سپند تہا۔ ۱۲

ف۶ مقدم یعنی آنا۔ آہنگ یعنی آواز۔ آلاپ۔ نشاط آہنگ۔ آہنگِ نشاط رکہنے والا یعنی سر دینے والا۔ سازِ صدائے آب مثلاً جلترنگ۔ ۱۲

ف۷ اندیشہ یعنی خیال۔ خاک نشینی کے زمانے کی کیفیتیں نہ پوچہ کہ ہم خاک نشین بسترِ خاک کو بسترِ سنجاب سمجہا کرتے تہے۔ اور زمین پر ہمکو بستر سنجاب کی سی راحت ملتی تہی۔

ف۸ جنونِ نارسا۔ عشقِ ناتمام۔ رو کش۔ مقابل۔

اک ایک قطرے کا مجہے دینا پڑا حساب	ف۱	خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تہا
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو	ف۲	توڑا جو تو نے آئینہ تمثال دار تہا
گلیوں میں میری نعش کو کہینچے پہرو کہ میں		جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگذار تہا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچہ حال	ف۳	ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آبدار تہا
کم جانتے تہے ہم بہی غمِ عشق کو پر اب		دیکہا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تہا

ف۱ یعنی آنکھوں سے اسقدر خون جاری رہتا ہے کہ گویا جگر میں جتنا خون تھا وہ مژگانِ یار کی امانت تھا، اور اسلیئے اسکے ایک ایک قطرے کا حساب اسی طرح دینا پڑیگا جسطرح امانت کا حساب دینا پڑتا ہے۔ (یادگار غالب) ۱۲

ف۲ آئینے سے یہاں آئینہ دل اور یک شہر آرزو سے ہجوم تمنا مراد ہے۔ ۱۲

ف۳ دشتِ وفا کی سراب کا ذرّہ ذرّہ تیغ آبدار کے جوہر سے مشابہ ہے۔ یعنی اہلِ وفا کے قتل کا سامان رکھتا ہے ۱۲ غرب دشتِ وفا کے لحاظ سے استعارۂ سراب بغایت موزوں ہے۔

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	ف۱	آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا
گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی		در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا
وائے دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھکو		آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا
جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے	ف۲	جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا
عشرتِ قتل گہ اہل تمنا مت پوچھ	ف۳	عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا
لیگئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط	ف۴	تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا
عشرتِ پارۂ دل زخمِ تمنا کھانا	ف۵	لذتِ ریشِ جگر غرقِ نمکداں ہونا
کی مرے قتل کے بعد اُسنے جفا سے توبہ		ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ف۶	حیف اس چارگرہ کپڑے کی قسمت غالب جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

ف۱ انساں ہونا یعنی حقیقی صفات وسیرتِ انسانی کا پیدا کرنا۔ ۱۲

ف۲ جلوہ۔ یعنی جلوۂ یار۔ جوہرِ آئینہ کو مژگاں سے مشابہ کیا ہے۔ ۱۲

۳ اہل تمنا تیری تلوار کو عریاں دیکھکر شوق شہادت میں ویسے ہی خوش ہوتے ہیں جیسے لوگ عید کا چاند دیکھکر ہوا کرتے ہیں۔ ۱۲

۴ بقدر رنگ گلستاں ہونا۔ یعنی فرطِ مسرت سے باغ باغ ہونا ۱۲

۵ اپنی ایذا دوستی کا اظہار کیا ہے۔ ۱۲

۶ یہ شعر نہایت خوب ہے لیکن دونوں مصرعوں میں قسمت کی تکرار نے کسیقدر بےلطفی پیدا کردی ہے۔ ۱۲

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱	تا محیطِ بادہ صورتخانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا	۲	جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے	۳	خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
پوچھ مت رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن	۴	دست مرہونِ حنا رخسار رہنِ غازہ تھا
نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بباد	۵	یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

۱ شوقِ ساقی۔ ساقی کی آمد کا شوق جو بادہ کشوں کے دل میں تھا۔ رستخیز اندازہ یعنی قیامت کی مانند۔ محیطِ بادہ خط شاغر جہانتک شراب ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شوقِ ساقی کے خمار میں کچھ ایسا قیامت کا جوش تھا کہ میخانے کی ہر شے یہانتک کہ شراب بھی خمیازہ کش ہو رہی تھی۔ اور اسطرح ایک صورتخانۂ خمیازہ کی کیفیت پیشِ نظر ہوگئی تھی۔ غرضکہ مضمون یہ ہے کہ ساقی کی آمد کی ہر شے مشتاق و منتظر تھی۔

محیطِ بادہ کی شکلِ منحنی کو خمیازہ کش کہنا نہایت دلپسند واقع ہوا ہے۔ ۱۲

۲ یکقدم وحشت۔ یعنی اندک وحشت۔ دو عالم دشت سے کثرت مراد ہے جادہ۔ یعنی جادۂ وحشت

جادۂ وحشت کی جزائے دو عالم دشت کا شیرازہ اس بنا پر کہا کہ یکقدم وحشت سے تمام دفترِ امکان کی حقیقت معلوم ہوگئی۔

مطلب یہ ہے کہ دفترِ امکان کا درس بصحبتِ عقل و ہوش بربنائے خوف و کم ہمتی مشکل تھا۔ وحشت نے اُسے آسان کر دیا کیونکہ وحشت نے اُس پست ہمتی کو مٹا دیا۔ ۱۲ واللہ اعلم۔

ف ۳ مجنونِ صحرا گرد کے گھر (یعنی صحرا) میں دروازہ بھی نہ تھا جو بند ہوتا اور لیلیٰ نہ آسکتی پر معلوم نہیں کیا سبب مانع ہے کہ وہ کبھی بتقاضائے وحشت وہاں تک نہیں پہنچ جاتی۔ ۱۲

ف ۴ استغنائے حسن کی شان یہ تھی کہ اُسے کسی دوسری چیز کی ضرورت نہ ہوتی۔ پس آئینہ اور غازے کا استعمال اندازِ استغنا کی رسوائی کا موجب ہے۔ ۱۲

ف ۵ دل گویا ایک دیوان تھا اور ہمارے دل اُس دیوان کے ورق تھے۔
نالۂ دل نے اُن اوراق کو پریشان کر دیا اور دل نے ایک دیوانِ بے شیرازہ کی شکل اختیار کر لی۔ ۱۲

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائینگے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئینگے کیا

بے نیازی حد سے گذری بندہ پرور کب تلک
ہم کہینگے حالِ دل اور آپ فرمائینگے کیا

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھکو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائینگے کیا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائینگے کیا

گر کیا ناصح نے ہمکو قید، اچھا یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائینگے کیا

خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگینگے کیوں
ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائینگے کیا

ہے اب اس معمورے میں قحطِ غمِ الفت اسد
ہمنے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائینگے کیا

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال یار ہوتا ‏‏— اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا ۱ — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا — کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

کوئی میرے دل سے پوچھے تری تیر نیمکش کو ۲ — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

رگ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا ۳ — جسے غم سمجھ رہے ہو یہ اگر شرار ہوتا

غم اگرچہ جاں گسل ہے نہ بچیں کہاں کہ دل ہے ۴ — غم عشق اگر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے — مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا — نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

۱ جھوٹ جانا یعنی تیرے وعدے کو۔ ۱۲

۲ تیر نیمکش یعنی وہ تیر جسکے لئے کمان پوری نہ کھینچی گئی ہو یعنی آہستہ سے لگایا گیا ہو۔ ۱۲

۳ شرار سنگ میں پنہاں ہوتا ہے۔ غالب کہتا ہے کہ اگر یہ شرار غم ہوتا تو رگ سنگ سے ایسا لہو ٹپکتا کہ پھر نہ بند ہوتا۔ یعنی پتھر پر بھی غم کا اسقدر اثر ہوتا۔ ۱۲

۴ دل کبھی غم سے خالی نہیں رہ سکتا اسلئے غم عشق ہی غنیمت ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو دیگر افکار دنیا کا رنج لاحق ہوتا۔ ۱۲

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۱ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
تجاہل پیشگی سے مدعا کیا کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا
نوازش ہائے بیجا دیکھتا ہوں ۲ شکایت ہائے رنگیں کا گلا کیا
نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں ۳ تغافل ہائے تمکیں آزما کیا
فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے ۴ ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا
نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے ۵ تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا
دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے ۶ غمِ آوارگی ہائے صبا کیا
دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر ۷ ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا
محابا کیا ہے، میں ضامن۔ ادھر دیکھ ۸ شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا
سن اے غارت گرِ جنسِ وفا سن ۹ شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا
کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا
یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں ۱۰ یہ کافر فتنۂ طاقت ربا کیا

بلا سے جاں ہے غالب اُس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا

لہ نشاط کے معنی اُمنگ کے ہیں۔ نشاطِ کار یعنی کام کرنے کی اُمنگ۔
مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا میں جو کچھ چہل پہل ہے وہ صرف اس یقین کی بدولت ہے کہ یہاں رہنے کا زمانہ بہت تھوڑا ہے۔ یہ انسان کی ایک طبعی خصلت معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر فرصت قلیل ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے کام کو سرانجام کرتا ہے'' (یادگارِ غالب)

ش ۲ نوازش‌ہائے بیجا۔ یعنی اغیار پر۔ شکایت‌ہائے رنگیں۔ نوازش‌ہائے بیجا کی شکایتیں جو بوجہ محبت ادا کی جاتی ہیں نہ بطریق رنج و شکوہ۔ ۱۲

ش ۳ تغافلِ تمکین آزما۔ ایسا تغافل جس سے ارباب شوق کے صبر و استقلال کی آزمایش کیجائے بے محابا یعنی بے تامل و بے تکلف۔ ۱۲

ش ۴ ہوس۔ ضدِ عشق صادق۔ ہوس کو عشقِ کاذب اور ناپائدار ہونے کی بنا پر شعلۂ خس سے تشبیہ دی ہے جس کی روشنی دم بھر سے زیادہ نہیں قائم رہ سکتی۔ ۱۲

ش ۵ شوقِ ساقی نے ہمکو پہلے ہی بیخود بنا رکھا ہے۔ اب اگر وہ عطائے شراب کے معاملے میں تغافل کرتا ہے تو ہمکو کیا شکایت ہو سکتی ہے۔

ش ۶ اگر آوارگی صبا کے سبب سے پیراہنِ یار کے عطر کی خوشبو پریشان ہو جاتی ہے تو ہمیں اسکا کیا غم۔ یعنی غم تو اُسوقت ہوتا جب ہمکو اُسکے سونگھنے کا دماغ بھی ہوتا۔ ۱۲

ش ۷ "ہر قطرے کے دل سے انا البحر کا نغمہ نکل رہا ہے" دوسرے مصرعے میں اس بیان کو اپنی ذات پر منطبق کیا ہے۔ اور اپنے کو ایک قطرہ قرار دیکر کہتا ہے کہ ہم ہی انا البحر (انا الحق) کے مقام میں ہیں کیونکہ ہم اُسی بحر بیکراں (ہستیٔ نامحدود الہی) کے ایک جزو ہیں۔ ۱۲

ش ۸ مشتاق کو شہید نگاہ کرنے میں تجھے کیا تامل ہے۔ اسکا میں ضامن ہوں کہ تجھسے کوئی خونبہا کا طلبگار نہوگا ۱۲ "ادہر دیکھ" خوب کہا ہے

ش ۹ شکستِ قیمت یعنی قیمت کا گھٹانا۔ اس سے ظاہر ہے کہ شکستِ قیمت کی کوئی صدا نہیں ہوتی۔ پس اسے جنس دل کے خریدار! ہمکو نہ توڑ کیونکہ اسکی شکست سے سامعہ نوازی نہیں ہوتی۔ ۱۲

ش ۱۰ "یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں" یعنی اسے قاتل یہ وعدہ صبر آزما کیوں ہے۔ اس دین

لطف یہ ہے کہ "قاتل" کو وعدۂ صبر آزما کی صفت بھی قرار دے سکتے ہیں۔ ۱۲

درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا ۱
سامنے کوئی بتِ آئینہ سیما نہ ہوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں ۲
تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا ۳
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ کہ دریا نہ ہوا

نام کا ہے مرے وہ دُکھ جو کسی کو نہ ملا
کام کا ہے مرے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہوا

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرے میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کل ۴
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑینگے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

۱ آئینے میں چونکہ شبیہ نظر آتی ہے اسلئے آئینہ سیما کی صفت بت کے ساتھ اس موقع کے مناسب ہے۔ ۱۲

۲ کیونکہ چشم خوباں کی بھی صفت "بیمار" ہے

۳ سینے کا داغ ہے یعنی ننگِ سینہ ہے۔ خاک کا رزق ہے۔ یعنی رائگاں ہے۔ ۱۲

۴ دیدۂ بینا کچھ لڑکوں کا کھیل نہیں ہے کہ اُسے قطرے میں دریا اور جزو میں کل نہ دکھائی دے یعنی دیدۂ بینا کو ضرور جزو میں کل دکھائی دیگا۔ ۱۲

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

۱ جنوں جولاں یعنی جولانِ جنوں دارندہ - پنجۂ مژگانِ آہو کو پشت خار قرار دیکر اپنی نسبتِ وحشت کا اظہار کیا ہے اور بس - ۱۲

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	۱	بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعوی پارسائی کا
نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بیوفائی کا	۲	بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعوی پارسائی کا
زکوٰۃ حسن دے اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا	۳	چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جانکر بیجرم قاتل تیری گردن پر	۴	رہا مانند خونِ بیگنہ حق آشنائی کا
تمنائے زبان محوِ سپاسِ بیزبانی ہے	۵	مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بیدست و پائی کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس واں نکہتِ گل ہے		چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو زنجیرِ رسوائی	۶	عدم تک بیوفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

نہ دے نامے کو اتنا طول غالب مختصر لکھدے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستمہائے جدائی کا

۱ بخششِ الہی کی نذر کیواسطے ہمارے پاس صرف شرمِ نارسائی کا تحفہ ہے - دوسرے مصرع میں تحفے کی تشریح کردی ہے یعنی ہمارے پاس اُس دعوائے پارسائی کا تحفہ ہے جو سو رنگ سے خون میں غلطیدہ ہے یعنی جسکا خون ہوچکا ہے - ۱۲

۲ حسن تماشا دوست - وہ حسن جسے یہ پسند ہو کہ لوگ اُسے دیکھیں - رسوا بیوفائی کا - فارسی ترکیب "رسوائے بیوفائی" کا ترجمہ ہے -

مطلب یہ ہے کہ اگر یار کو میرے علاوہ وہ سوں کو بھی اپنا نظارگی حسن بنانا پسند ہے تو اس سے اسپر بیوفائی اور شکستِ عہدِ پارسائی کا الزام عائد نہیں ہوسکتا - کیونکہ اُن دیکھنے والوں کی نظریں تو گویا مہر

ہیں جنسے اسکی پارسائی کا دعویٰ ثابت ہے ۱۲

ف۳ کہ یعنی "تاکہ" یا "جسکے سبب سے" استعارہ کو دور کرنیسے اس بلیغ شعر کا مختصر مطلب یہ نکلتا ہے کہ اپنے جلوۂ دیدار سے چشمِ مشتاق کو روشن کر۔ ۱۲

ف۴ یعنی حقِ آشنائی یہ تھا کہ تو مجھکو مار ڈالتا۔ ۱۲

ف۵ زبان کی تمنا متقاضی تھی کہ بیدست و پائی کی شکایت کی جائے لیکن چونکہ مجھکو بیزبان دیکھکر انکو خود بخود رحم آگیا، اسلئے تمنائے زبان، بیزبانی کی ستایش کر رہی ہے کیونکہ بے زبانی ہی اب شکوۂ بیدست و پائی کی ضرورت باقی نہ رہی ۔ ۱۲

ف۶ بت خود بیوفا ہوتے ہیں جب وہ بھی تجھے بیوفائی کا طعنہ دیتے ہیں تو خیال کرنا چاہئے کہ تیری بیوفائی کا درجہ کسقدر بڑھا ہوا ہے۔

زنجیر رسوائی کی ترکیب نہایت غور از کار ہے ۔ غالباً مطلب اس سے یہ ہوگا کہ بتانِ بیوفا کے حلقہائے دہن ملکر زنجیرِ رسوائی بنگئے ہیں یا یہ کہ حدیثِ بیوفائی یار ایک بت سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے تک پہونچی ہے اور اسطور پر ایک زنجیر رسوائی کی شکل نمودار ہوگئی ہے ۔ واللہ اعلم ۔ ۱۲

ف۷ یعنے تمہارے جدائی کے بیان کرنے کی حسرت رکھتا ہوں ۔ اس میں اشارہ اس امر کی جانب ہے کہ انکی کثرت کی وجہ سے میں بیان سے قاصر ہوں ۔ ۱۲

گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائیگا	لے	بے تکلف داغِ مہ مہرِ دہاں ہو جائیگا
زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب	ٹے	پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائیگا
لے تو لوں سوتے میں اُسکے پانو کا بوسہ مگر		ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا
دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا		یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری، جو تو راضی ہوا — مجھپہ گویا اک زمانہ مہرباں ہوجائیگا

۳ گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط — شعلہ خس میں جیسے، خوں رگ میں نہاں ہوجائیگا

باغ میں مجھکو نہ لیجا ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خونفشاں ہوجائیگا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہوا — اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہوجائیگا

فائدہ کیا، سوچ، آخر تو بھی دانا ہے اسد
دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہوجائیگا

۱ مُہر داں - مُہرِ خاموشی - داغِ ماہ کو باعتبار سیاہی و مشابہت مُہر سے تعبیر کیا۔ مطلب اس شعر کا صاف نہیں ہے ۱۲

۲ چاندنی کی تشبیہ سیل سے بالکل نئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہجرِ یار میں چاندنی موجبِ آزار و بربادی ہوجائیگی ۱۲۔

۳ نگاہِ گرم یعنی نظرِ مہر - خون رگ میں اسطرح نہاں ہوجائیگا جیسے شعلہ خس میں ہوتا ہے۔ ۱۲

۱ دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا بُرا نہ ہوا

جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو — اک تماشا ہوا گِلا نہ ہوا

ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں — تو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

ہے خبر گرم اُنکے آنے کی — آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

۲ کیا وہ نمرود کی خدائی تھی — بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

زخم گر دب گیا لہو نہ تھما ۳ کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج **غالب** غزلسرا نہ ہوا

۱ میں نہ اچھا ہوا تو کچھ بُرا نہ ہوا کیونکہ اگر اچھا ہوجاتا تو مجھے دوا کا احسانمند ہونا پڑتا حالانکہ دوا کا احسان لینا مجھے منظور نہیں۔

۲ بندگی یعنی عبودیت۔ بندگی پر مردود کی خدائی کا اطلاق کرنا بالکل نئی بات ہے۔
کہتا ہے کہ میری بندگی کیا مردود کی خدائی تھی کہ اُس سے مجھکو سوا نقصان کے کچھ فائدہ نہ پہونچا۔
(یادگار غالب)

۳ یعنی اگرچہ ہمارا زخم دب گیا ہے لیکن ہنوز اُس سے خون جاری ہے اسلئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا کام رُکا نہیں کیونکہ اگر زخم دب جاتا اور خون بھی تھم جاتا اُسوقت البتہ کہہ سکتے تھے کہ کام رُک گیا (یعنی کام روا نہوا) یہاں زخم کے دبنے سے نامکمل طور پر دبنا مراد ہے یعنی ایسا کہ اُس ہی کسیقدر اُس حالت میں بھی خون جاری رہے ۱۲۔ واللہ اعلم

گِلا ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا ۱ گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب ۲ مگر ستمزدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا
حنائے پائے خزاں ہے بہار اگر ہے یہی ۳ دوام کلفتِ خاطر ہے عیش دنیا کا
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ۴ مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا
ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں ۵ کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

دل اسکو پہلے ہی ناز و ادا سے دے بیٹھے	۶	ہمیں دماغ کہاں حسن کے تقاضا کا
نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے	۷	مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اسکو یاد اسدؔ ۸
جفا میں اُسکی ہے اندازِ کار فرما کا

۱ دل میں ہی - یعنی اگرچہ وسعتِ دل مشہور ہے - مگر گو دل سے اور شوق کو اضطراب دریا سے مشابہ کیا ہے - ۱۲

۲ پاسخ مکتوب یعنی جوابِ خط - مطلب یہ ہے کہ شوقِ خامہ فرسائی سے مجبور ہوں ورنہ یہ تو معلوم ہے کہ تو جوابِ خط نہ دیگا - ۱۲

۳ بہار کو بوجہ رنگینی "حنائے پائے خزاں" کہا - کہتا ہے کہ دنیا کا عیش ہمیشہ کلفتِ خاطر کا باعث ہوتا ہے مثلاً بہار کو لے لیجئے کہ وہ پائے خزاں کے لئے حنا بنجاتی ہے - اور ظاہر ہے کہ استعمالِ حنا سے کسقدر پابندی و بیدست و پائی لازم آتی ہے - ۱۲

۴ خندۂ گل کو خندۂ بیجا اسلئے کہا کہ وہ کچھ سمجھکر یا ازراہِ تعجب نہیں ہنستا ہے - پس گویا اُسکا خندہ بیمحل ہے (یادگارِ غالب)

۵ مصرعۂ ثانی کے شروع میں "باوجودیکہ" یا "اگرچہ" بڑھا کر پڑھنے سے مطلب صاف ہوجاتا ہے - ۱۲

۶ "تقاضا کا" اب بالکل متروک ہے "تقاضے کا" چاہیئے - غالباً قافیے کی ضرورت نے مرزا کو مجبور کیا ہوگا - ۱۲

۷ یہ نہ کہہ کہ (میری آنکھوں سے دریا جاری ہے لیکن) میرا گریہ بمقدار حسرتِ دل ہے کیونکہ مجھے دریا کی کائنات معلوم ہے -

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ شدت گریہ کی وجہ سے میری آنکھوں سے دریا رواں ہے لیکن پھر بھی میری حسرت دل کے حوصلے کے موافق نہیں ہے۔ ۱۲

ثہ یعنی فلک کو دیکھ کر وہ یاد آتا ہے کیونکہ جو کچھ ستم فلک کرتا ہے اُسی کے حکم سے کرتا ہے ۱۲

قطرہ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا | لہ | خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا
اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا | | غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

لہ جب ساغر مے لبِ یار سے ملا تو قطرہ ہائے مے بغرضِ حیرت منجمد ہو کر گویا گوہر بن گئے اور خطِ جام رشتۂ گوہر کی مانند ہو گیا۔ ۱۲

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا | | تپشِ شوق نے ہر ذرے پہ اِک دل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرتکدۂ شوخیٔ ناز | لہ | جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا
یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا | ٹہ | عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

نہ بندھے تشنگیٔ شوق کے مضموں غالبؔ
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

سلہ عکسِ روئے یار کی وجہ سے آئینہ گویا ایک حیرتکدہ بن گیا ہے اور یار کی شوخیٔ ناز کی اثر سے جوہرِ آئینہ اس حیرتکدۂ آئینہ میں طوطیٔ بسمل کی مانند پھڑک رہا ہے۔ جوہرِ آئینہ کو اسکی بیتابی کے ظاہر کے اعتبار سے طوطیٔ بسمل سے مشابہ کیا ہے ۱۲

اس میں ایک نازک اشارہ اس امر کی جانب بھی ہے کہ نازِ یار کی شوخی نے حیرت کو اضطراب سے بدل دیا۔

ٹہ دلِ سائل کو ایک طلسم اور جنگ گاہِ یاس و امید قرار دیا ہے۔

اس طلسم کی بانی پست ہمتی ہے جو اکثر محرک سوال ہوا کرتی ہے اور اس میں امیدِ قبول اور یاس ردِ سوال سے جنگ ہوا کرتی ہے۔ واللہ اعلم۔

میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں	لہ	گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں		وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

لہ یعنی اُسنے زبردستی کیوں نہ پلادی (یادگارِ غالب)

گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	لہ	بحر گر بحر نہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیٔ دل کا گلا کیا، یہ وہ کافر دل ہے		کہ اگر تنگ نہوتا تو پریشاں ہوتا
بعد یک عمر ورع بار تو دیتا بارے		کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

لہ مصرعۂ ثانی مثال ہے۔

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہوتا تو خدا ہوتا	لہ	ڈبویا مجھکو ہونے نے نہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بےحس تو غم کیا سر کے کٹنے کا		نہوتا گر جدا تن سے تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مرگیا پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ یوں ہوتا تو کیا ہوتا

لہ جب دنیا میں کچھ نہ تھا تو خدا ہی خدا تھا اور اگر موجوداتِ عالم کا ظہور نہوتا تب بھی خدا ہی خدا ہوتا۔

پس غالب کہتا ہے کہ میری ہستیٔ ظاہر نے مجھکو ایک شے دیگر قرار دیکر برباد کر دیا کیونکہ اگر میں

پیدا نہوتا تو خیال کرنا چاہیئے کہ کیا ہوتا ظاہر ہے کہ خدا ہوتا (یعنی ذاتِ الٰہی کا ایک جزو رہتا) کیونکہ یہ پہلے ہی طے ہو چکا ہے کہ اگر کچھ نہوتا تو خدا ہی خدا ہوتا۔ ۱۲

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا	ف۱	یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی	ف۲	کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل		کہتے ہیں جسکو عشق خلل ہے دماغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے	ف۳	تریاکئ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے		پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار	ف۴	یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل	ف۵	ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

ف۱ موسمِ بہار کا ذکر کرتا ہے کہ آجکل باغ کا ایک ذرۂ زمین بھی بیکار نہیں ہے۔ مثلاً باغ کی روشوں پر آمد و رفتِ مردم کی وجہ سے کچھ نہیں اُگتا لیکن اس زمانے میں جوشِ گل کی یہ کیفیت ہے کہ روشیں بھی گلہائے سُرخ کی کثرت کی وجہ سے گویا لالے کے داغ کا فتیلہ بنی ہوئی ہیں۔ واللہ اعلم۔

فتیلہ یا فلیتہ۔ یعنی بتی جو بہت جلد آگ قبول کرلے (غیاث)۔ یہاں جادۂ چمن کو فتیلہ کہا گویا اُس سے لالے کو داغ روشن ہوتے ہیں۔ مطلب اس شعر کا صاف نہیں ہے۔ ۱۲

ف۲ آشوب بمعنی شور و غوغا۔ آگاہی کو آشوب قرار دیا جسکی برداشت کے لئے میگساری لازم ٹھیری۔ اور ظاہر ہے کہ اس غرض کے لئے ایک ساغر سے کیا کام چلسکتا ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ساغر بھی لبریز نہو بلکہ صرف ایک حدِ مقررہ (خطِ ساغر) تک شراب سے پُر ہو۔ ۱۲

آگاہی کے لئے ہجومِ افکار و خیالات لازمی ہے۔ اسی بنا پر اُسے آشوب کہا۔

ف۳ ، وہ چراغ کو تریاک اور اس تریاک کے نشے کو نشۂ فکرِ شعر قرار دیا۔

مطلب یہ ہے کہ مینے مدتوں چراغ کے سامنے بیٹھکر رات بہ فکرِ سخن کی ہے ۔۱۲

ف۴ آنکھ کو میکدے سے اور خونِ دل کو شراب سے مشابہ کیا ہے۔ جسطرح سے کہ میکدہ بغیر شراب کے ویران ہوتا ہے اسیطرح میری آنکھوں میں خونفشانی کے بغیر گویا خاک اُڑ رہی ہے ۔۱۲

موجِ نگاہ کی تشبیہ غبار سے بہت مناسب ہے۔ اور میکدے کے لیئے خراب کا لفظ بھی کیفیت سے خالی نہیں۔ ۱۲

ف۵ ابرِ بہار میری مستی کا باعث نہیں ہوسکتا یعنی مطلب یہ ہے کہ میرے سرورِ دل کا موجب تیرے حُسن کا شگفتہ باغ ہے۔

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا ف۱ رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز ف۲ چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ اسقدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اُسے سرگرمِ خرام ف۳ رُخ پہ ہر قطرۂ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بدخو ہوگا ف۴ نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ف۵ ہر قدم سائے کو میں اپنے شبستاں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل تا دمِ مرگ ف۶ دفعِ پیکانِ قضا اسقدر آساں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اُسکو وفادار اسد
غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

ف۱ جسطرح عنوان کی بے ربطی سے مضمونِ خط کی آشفتگی کا حال کھل جاتا ہے اسیطرح سے

میری جبیں سے میرے غمِ پنہاں کا حال یار پر ظاہر ہوگیا۔ ۱۲

چینِ جبیں کی تشبیہ عنوان سے بہت مناسب ہے۔

۲ صیقل سے جو خط آئینے پر پڑتا ہے وہ ہو بہو الف کی مانند ہوتا ہے تو (گویا آئینہ۔) خط مذکور ابھی الف ہی کی مشق کر رہا ہے۔ (یعنی) ہنوز روزِ اول ہے۔

مگر چاک گریباں اپنا کہ وہ بھی بصورت الف تھا، سیکڑوں شکلیں اس کی بدل گئیں۔ تو معلوم ہوا کہ مشق گریباں دری میں آئینہ مبتدی ہے اور حضرت غالب کا گریباں منتہی۔ (وثوق صراحت)

بریکٹ کے اندر کی عبارت راقم کی ہے باقی حصہ مولوی عبدالعلی صاحب والہ حیدرآبادی کی کتاب "وثوق صراحت" سے نقل کیا گیا ہے۔ اس شعر کا مضمون صاف نہیں ہے لیکن بنا بر جناب والہ کے پیش کردہ مطلب کے سوا اور کوئی مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ واللہ اعلم۔

اس قسم کے مضمون کا ایک اور بھی شعر "رائے مہملہ" کی ردیف میں ہے ؎

فنا تعلیم درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے	کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

۳ بدگمانی یا رشک نے یار کا مصروفِ خرام ہونا چاہا۔ کیونکہ خرام سے قطرہ ہائے عرقِ جبینِ یار پر نمودار ہو جاتے جو دیدۂ حیرانِ عاشق سے مشابہت رکھتے۔ ۱۲

۴ اپنی عاجزی کو خس سے اور اس کی برخوئی کو شعلۂ سوزاں سے مشابہ کیا ہے۔ ۱۲

۵ جب سفر کے تکان کا غلبہ ہوتا ہے تو مسافر دم لینے کے لئے سایہ تلاش کرتا ہے۔ لیکن جب سفرِ عشق میں ضعف راحت طلب ہوا تو شاعر کہتا ہے کہ میں اپنے سائے کو آرامگاہ سمجھا۔"

اس بیان سے اپنی کمال مجبوری کو ظاہر کرتا ہے یعنی عشق کا سخت سفر، اس میں ضعف کا غلبہ اور آرام کے لئے سائے کی تلاش۔ وہاں سائے کا ناپید ہونا اور مجبوراً خود اپنے سائے کو شبستان